نظم آزاد

جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

مصنفہ

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد
سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور

سنہ ۱۸۹۹ء
مفید عام پریس لاہور میں چھپی

فہرست مضامین

بحضور جناب

کرنیل ڈبلیو آر ایم ہالرائڈ صاحب بہادر

سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب

اے مُلکِ سخن کے بادشاہ! نظمِ اُردو زبان زبان پر شکر گذار ہے۔ کہ آپ کی توجہ سے وہ بندِ حُسن و عشق سے آزاد ہوئی۔ فقیر آزاد کے پاس کیا ہے جو آپ کے پیشکش کرے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہاں! یہ چند بکھرے ہوئے پھول آپ کے باقبال نام سے چُن کر حاضر ہوتا ہے۔ کہ آپ پر نثار کرے ٭ یا اللہ تو مقبول خاص و عام کر ٭

آزاد بامراد جو بندہ ہے آپ کا ہے دل سے پاس گرچہ سلامی ہے دور کا

ہے بے ہنر کہ باہنر اچھا ہے یا بُرا جو ہے سو ہے مگر ہے دُعاگو حضور کا

بندۂ آزاد محمد حسین

تمہید

عرصۂ دراز سے والد ماجد کے احباب متقاضی تھے کہ اُن کی نظموں کو جمع کرکے شائع کردیا جائے۔ میں نے بھی مناسب سمجھا چھٹے پُرانے پُرزے چھوٹی چھوٹی نظمیں جو کہیں کہیں طبع ہوچکی تھیں۔ اور بعض تھیں کہ لوگوں کی نظر سے بھی نہیں گذری تھیں۔ ممکن تھا کہ ضائع ہوجائیں۔ اس لئے جمع کرکے ایک پمفلٹ کے طور پر چھپوادی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کی بہت سی نظمیں مجھے ہاتھ نہ آئیں معلوم نہیں حالت پریشانی میں کہاں ضائع ہوگئیں۔

شعر و شاعری کا شوق انہیں ابتدائے عمر سے تھا جیسا کہ دیوان ذوق کے ابتدائی صفحوں میں اُنہوں نے خود تحریر فرمایا ہے۔ اور طالب علمی کے زمانہ سے اُستاد ذوق علیہ الرحمتہ کی حضوری میں رہتے تھے۔ خود بھی کہتے تھے۔ اُستاد مرحوم کی وفات کے بعد خود کہنے کی زیادہ ضرورتیں لاحق ہوئیں۔ اور اپنا کلام مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ لیکن اُس وقت صرف غزل۔ رُباعی۔ قصیدہ وغیرہ تک شوق محدود رہا۔ افسوس ہے کہ اُس وقت کا کلام جس قدر تھا ۱۸۵۷ء کے طوفان میں تباہ ہوگیا۔ اور اس کا کوئی نمونہ اس وقت میرے پاس نہیں جو اس مجموعہ میں شامل کروں۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جگراؤں پہنچے۔ اور پھر سرکار جیند میں ملازم ہوئے۔ تو اُنہوں سے سلام۔ مرثیہ۔ قصائد اور غزلیں لکھیں۔ ان میں سے بعض مجھے ہاتھ آگئیں۔ لیکن اس مجموعہ میں صرف ایک قصیدہ

درج کیا گیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۱۰)۔ مرثیہ وغیرہ چھوڑ دیئے ہیں۔ اس کے بعد روزی کی فکر نے عرصۂ دراز تک فرصت نہ دی کہ شاعری کی طرف توجہ کرتے۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب دفتر ڈائرکٹری میں تصنیفات کے کام سے تعلق ہو گیا۔ اس وقت پھر خیال اس طرف متوجّہ ہؤا۔ کیونکہ کرنیل ہالرائڈ صاحب بہادر اعلےٰ درجہ کے مبصّر۔ نکتہ سنج اور زباندانی کے شوقین تھے۔ ان کی طبیعت کو نیچر نے خاص ملکہ اِس کام کا دیا تھا۔ دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ جس کام کا شوق حکام کو ہو جاتا ہے۔ اسی طرف ماتحت بھی متوجّہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ صاحب موصوف کی ہدایتوں کے بموجب اُنہوں نے اس نئے ڈھنگ کی نظم لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ جو کہ اب خاص وعام لکھنے لگے ہیں۔ اور گھر گھر میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے نظم اور اُسی کے متعلق ایک مضمون اُنہوں نے مئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھا۔ جو اس مجموعہ کے صفحہ (۱) سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت پُرانے خیالات کے لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اور ہندوستان کے مختلف اخبارات میں خوب گالیاں دیں۔ مگر قدرتی موج کو کسی طرح روک نہ سکے کہ چشمہ نہ نکلا تھا۔ البتہ اتنا اثر اس مخالفت کا ہؤا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکا اس کی بنیاد ایسے مبارک وقت میں پڑی تھی۔ کہ اب ہر شہر و دیار میں اسی قسم کی نظمیں تصنیف ہوتی ہیں۔ اور لوگ اُن کو قومی نظمیں کہتے ہیں ؀

مشاعرہ مذکورہ بالا کے بند ہونے کے بعد وہ کبھی کبھی انگریزی نظموں کے انداز پر نظم لکھتے رہے۔ یہ بالکل انگریزی نظم کا ترجمہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ناظرین مقابلہ کر کے دیکھینگے کہ انگریزی نظم (ایکسیلشیر) کے

انداز پر جو نظم ہے (دیکھو صفحہ ۹۴ - الوالعزمی کے لئے کوئی سدِ راہ نہیں)-
وہ ترجمہ نہیں ہے - البتہ انگریزی مطالب کو ہمارے انداز میں اُردو
کے قالب میں ڈھالا ہے - اسی طرح تمام نظمیں صفحہ ۸۹ سے ۱۰۳
تک انگریزی مطالب ہیں - مگر اُن کو نہیں کہہ سکتے - کہ یہ انگریزی کا
ترجمہ ہے - والد ماجد کے مختلف احباب سے التماس ہے کہ اگر کوئی
نظم اُن کے پاس ایسی موجود ہو جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہو - تو وہ
براہ عنایت میرے پاس ارسال کریں تاکہ طبع ثانی میں شامل کردیجائے ٭

اس موقع پر میں نے چاہا تھا کہ والد ماجد اِن مسودوں پر نظر ثانی
کردیں - مگر وہ چند سال سے فلسفہ الٰہیہ اور اُس کی کتابوں کے مطالعہ
کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں - طبیعت اِدھر نہ آئی - فرمایا "جو ہوگیا -
سو ہوگیا - اب نہیں ہو سکتا - وہ عالم اَور تھا - یہ عالم اَور ہے - تمہیں
شہرت کا شوق ہے - چھپوا دو" مجھ سے یہی ہو سکا - کہ جس طرح اصل
مسوّدوں میں تھا چھپوا دیا - پروردگار حسن قبول روزی کرے ٭

خاکسار

محمد ابراہیم

مترجم چیف کورٹ پنجاب

لاہور

مؤرّخہ ۲۴ - جولائی ۱۸۹۹ء

تقریر جلسہ منعقدہ ۱۸ اگست ۱۸۶۷ء

نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات

فلاسفۂ یونان کا قول ہے۔ کہ دنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اوّل نبضِ انسانی کہ بے گویائی حالِ باطن بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انہیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اُس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلامِ موزون و مقفّٰی لکھے ہیں۔ لیکن در حقیقت چاہیئے۔ کہ وہ کلام مؤثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اُس کا سُننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو۔ لیکن اثر سے خالی ہو۔ تو وہ ایک ایسا کھانا ہے۔ کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ نہ کھٹا نہ میٹھا۔ جیساکہ شعر کسی استاد کا ہے ؎

دندانِ تو جملہ در دہانند   چشمانِ تو زیرِ ابروانند

جب انسان کے دل میں قوت گویائی اور جوششِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اُس قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا۔ اُسی قدر کلام پرتاثیر ہوگا۔ روے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا۔ کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدم کے دل پر طاری ہوا اُسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیئے۔ کہ باوجودیکہ اُس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا۔ مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اُس وقت اُن کی زبان سے نکلا موزون تھا۔ چنانچہ وہ سُریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزون کی حضرت آدم سے ہوئی۔ تو فرزند رشید وہی موزون طبع ہے۔ کہ جو باپ کی

میراث سے بہرہ ور ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوت انسانی بھی اُسی میں کامل سمجھنی چاہیئے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زور طبیعت سے نکلتی ہے یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون کوئی مطلب کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے۔ تو تکلم سے نقش مدعا کو رنگ تقریر میں لاتا ہے۔ تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصوّر ہے۔ لیکن وہ مصوّر کہ خر و اشتر۔ درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصوّر ہے کہ معنی کی تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر قلم مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے۔ مگر صدہا سال سے آج تک اُن کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویر غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامین فرحتِ عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہا کمال یہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے اہل عرب معرکہ ہائے قتل میں رجز خوانی کرتے تھے سلاطین ہند کے ہاں صفِ جنگ میں شُتور۔ وِیر۔ راوت۔ بھاٹ وہ وہ کڑکے کوِت کہتے تھے کہ لوگ اپنی جانیں موت کے منہ میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ عالم ہے۔ کہ جب سُنے جاتے ہیں بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندر اعظم کتاب ہومر کو دیکھتا تھا اور سوتے میں بھی جدا نہ کرتا تھا۔ شاعر اگر چاہے۔ تو امورات عادیّہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے درختانِ پادرگِل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال۔ حال کو استقبال کر دے دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان۔ خاک کو طلا۔ اندھیرے کو اجالا کر دے

اگر غور کر کے دیکھو۔ تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہئے۔ کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہے ترازو اُس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے جدہر چاہے جھکا دے +

نظم درحقیقت ایک شاخ گلریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبوئیاں محسوسِ دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے۔ کسی کی بو مست ہے۔ کسی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں۔ کبھی ہار میں۔ کبھی عطر کھچ کر۔ کبھی عرق میں جا کر۔ کبھی دور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں اپنے رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں +

عالمِ جسمانی میں انسان کے لئے غذا مادۂ حیات ہے۔ اسی طرح عالم معنی میں روح کے لئے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامینِ لطیف سے روح قوتِ کمال اور طاقتِ بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اُس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے۔ کہ وہ خاص روح القدس کے آفتاب قدرت کا پرتو ہے۔ اسی سے شعر کے جوہر لطافت کو خیال کرنا چاہئے۔ کہ نفاست میں کس مرتبہ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبتِ خاص عالم بالا سے ہے۔ کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے۔ کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ ظاہرا اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے جیسے

کوئی صاحبِ خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہان کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے۔ اور یہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے زہے سعادت اُس کی جسے ایسے ملک معنی کی سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتوہ ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر۔ تاثیر معنوی کا ست ہے۔ روح کے لئے آبِ حیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی۔ ذہن کو قوتِ پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت۔ سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردد میں غرق رہتا ہے۔ لیکن ایک شعر کر کر جیسی اُس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے۔ کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لطف طاقتِ تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔ اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے۔ صاحب درد ہی اُسے خوب جانتا ہے۔ کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونیٔ طبع جوہر خداداد ہے اور اس نعمت کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ رباعی

سرمۂ چشم عشق بوالہوس را ندہند	سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار	ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

جنون بھی ایک طرح سے لازمۂ شاعری ہے۔ بعضے محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے۔ کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اُس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے +

اکثر لوگ ایسے ہیں۔ کہ جسمانی محنت سے مرکھپ کر انھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطف شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں ایک مصرع پُر درد اُن کی زبان سے نہ نکلے اُن کا ذکر بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں آئیگا +

بعضے ایسے ہیں۔ کہ اُن سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انہیں موزون و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضب الٰہی ہے خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں۔ مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان اُن کی صاف ہے۔ مگر مضامین عالی نہیں۔ چنانچہ ہر ایک کی جگہ پر بجائے خود اشارہ کیا جائیگا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوش مضامین اور شگفتگی طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طبائع موزون زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعری کے لئے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اوّل خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے خواہ

گھر میں گوشۂ عافیت ہو۔ خواہ باغ خواہ صحرا خواہ کنار دریا۔ اور دل ہمہ تن اُسی میں مصروف ہو +

اکثر وقت شب کہ جب خلق خدا اپنے اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سن سان ہو جاتا ہے۔ تب اس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے اور مضمون پیڑتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف۔ ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پر معانی زبان سے متراوش ہوتے ہیں +

شاعر کو چاہیئے۔ کہ طبیعت اس کی زیادہ تر قابل اور متاثر ہو مثل آب رواں کہ جو رنگ اُس میں پڑ جاتا ہے وہی اس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے۔ **مائل** کی رباعی اس مقام پر مجھے یاد آئی ہے

کعبہ میں بھی ہم نے اُسے جاتے دیکھا
اور دیر میں، ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے بہ ہفتاد و دو ملت مائل
ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اُس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت۔ یا غم۔ رزم یا بزم کا باندھتا ہے جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے اتنا ہی اثر سننے والے کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں۔ کہ جب وہ شعر سنتے ہیں تو دل

بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کا دل مثلِ آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ اُن کے سامنے اگر طلسماتِ معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو تو بھی انہیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنی اس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشندلان اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروبِ آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نوبہار قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلان بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے۔

علم موسیقی کا لطف اور گلزار بو قلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بیچارے اُن کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جو لوگ لطف طبیعت اور صفائی دل سے محروم ہیں وہ کیفیتِ شعر و فصاحت کلام سے محروم ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضی طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں تو بیشک شعر بالکل کار بیفائدہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبع موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ وکسبِ دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علے العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فے الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنی اور اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صنّاع خبث طبیعت سے صنعت کو بُری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہ سکتے۔ مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہلِ ہدایت ثبوت ذاتِ باری

اور تصدیق وحدت الٰہی کرتے ہیں اُسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پر استدلال کرتے ہیں
پس جس طرح سے ان کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا۔ اسی طرح
شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت
ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش خروش
خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اُسی قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے
خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں +
ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور
اُن تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے
البتہ فصاحت اور بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس
کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے انہوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی
کی لوگ اس میں ترقی کرتے گئے ورنہ اسی نظم شعر میں شعرائے اہل کمال نے
بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی بنا فقط پند و اندرز پر ہے اور اُن سے ہدایت
ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و
حکیم سنائی و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہاں اور محاسن قبائح
کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے
گو آج نہیں مگر امید قوی ہے۔ کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک
حاصل ہو۔ آزاد ؎

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھیگا ــــــ نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے۔ کبھی تو دیکھیگا

بندہ آزاد محمد حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضمون لیکچر

اے حاضرین با تمکین! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے۔ جسے اہل عالم مملکت ہندوستان کہتے ہیں۔ اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حب الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی۔ امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پردازی اُردو زبان کی ہے۔ جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پُرانی بنیادیں نکالی جائیں۔ اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اُردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے۔ جس میں فارس کے مسافروں نے آکر عمل دخل کیا۔ اور صاحب خانہ نے اِس بن بُلائے مہمان کو اپنے وسعت اخلاق سے اُس کے خاطر خواہ جگہ دے دی ۔

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی مگر درباروں اور علموں پر ماں کا قبضہ تھا یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے دریا لوٹتے تھے۔ اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں

پوری کرتی تھی۔ چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلےٰ درجہ پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں ہیں۔ پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں +

جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی۔ تو کئی سو برس تک اُس میں باتیں ہی باتیں رہیں۔ یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہاں کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی۔ تو ولی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جابجا دیوان ترتیب ہونے لگے +

اُردو کے مالک اُن لوگوں کی اولاد تھے۔ جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے۔ اسی واسطے اُنھوں۔ نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دلچسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹوگراف فارسی سے اُردو میں اُتار لیا تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوشنمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔ اُنھیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنبا چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں اُن کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم اور اسفندیار کی بہادری۔ کوہ الوند اور بےستون کی بلندی۔ جیحوں سیحوں کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا۔ کہ ارجن کی بہادری ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں اور گنگا۔ جمنا کی روانی

کو بالکل روک دیا *

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ کہ اُس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش وخروش کا زور پیدا ہوگیا۔ اس کے استعارے اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہوگئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم ونثر سے آئے ہیں۔ جہاں کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے انہیں پھولوں کا عطر اس زبان میں آیا۔ بے شک اُن کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے۔ اس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو۔ تو باریکی اور تاریکیئے الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے۔ کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب *

اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے۔ کہ مبالغے اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُڑتے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شئے پر رغبت یا اُس سے نفرت۔ کسی شئے سے خوف یا خطر یا کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو۔ اُس کے بیان سے وہی اثر۔ وہی جذبہ۔ وہی جوش سُننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک مبالغے کا زور تشبیہ اور استعارے کا نمک۔ زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ

یا در باریا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اَور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولینگے تو دیکھینگے۔ کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار۔ طرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمّت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑکر آگے بڑھائے +

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پُرانے ہوگئے۔ اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہموطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں اس کا درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں کرتے۔ کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کرکے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ وطن کا فرض ہے کہ

قرض سے زیادہ اُس کا ادا کرنا واجب ہے +

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا۔ اور اُس سے نظم اور انشائے اردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی۔ کہ بھاشا اور فارسی دونو سے واقف تھے۔ تم خیال کرو کہ جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہٖ اُردو و انگریزی کا حال ہے۔ پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتوہ حاصل ہوگا۔ تو اُنہی لوگوں کی بدولت ہوگا۔ جو دونو زبانوں سے واقف ہونگے اور سمجھینگے۔ کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں۔ جو اُردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں +

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش۔ اور لطائف و صنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے۔ کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزاں فلک کی شکایت اور اقبالمندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں۔ اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگذشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں +

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل

اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں - اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے - بے جگہ لُٹاتے ہیں کیسی حسرت آتی ہے - جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں - کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں - اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں - اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں - لیکن ہمیں کیا ؟ سُن کر ترسیں - اپنے تئیں دیکھکر شرمائیں - کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں - اُتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے - جس کے اعلےٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں - پھر بھی ہم دیکھتے ہیں - ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دل پسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں - کہ اگر ہمّت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں ؀

اے میرے اہل وطن ! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں - جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا - وجہ اس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے - کئی پُرانی مورتیں باقی ہیں - وہ چراغ سحری ہیں - انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو گی - اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہو گا ؀

میرے اہل وطن ! آؤ آؤ - برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو - اُٹھو اُٹھو - وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ - تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے - اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو - نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی کہ اُن کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گی - اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے ؀

اس میں کچھ شک نہیں کہ سردست یہ کام کچھ مشکل ہے۔کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحرالبیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہائے ہیں۔ جب یہ دلپسند خیالات۔شستہ الفاظ۔پاکیزہ ترکیبیں۔خوشنما تراشیں۔ مضمون کی گرمیاں۔ انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں کہ سُننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن میں سے جس کو چاہے لے لے۔اور اُن پر شاعری خرچ کرکے وہی لطف کلام میں پیدا کرلے۔تو آج نہایت مشکل بات ہے۔تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریے ان مزاروں پر پھول برساتے ہیں۔جن کے سونے والوں نے اُنہی چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں۔جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں۔اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیندہ انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں ؛

تو بھی ہمیں مایوس ہونا نہ چاہیئے۔ اگر کوشش کرینگے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھینگے۔کیونکہ دلّی دن بھر میں گلزار نہیں ہوگئی تھی۔اِس سے بڑھکر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں۔ وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں۔جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذّت کم ہو تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی سے رنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوت زبان و بیان، اور اصلی فصاحت اعلےٰ درجہ کی چاہیئے۔تب ہر ایک مضمون کو ویسا

ہی گرمائے۔ جس سے سننے والوں کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں۔ آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو۔ تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی ٭

میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو۔ ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں۔ کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوت نظم خود حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اُس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جزو مسلمان۔ جن کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے۔ کہ جس میں مرد تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پُرزور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔ کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرف تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں۔ کہ اَوروں کے سامنے ہماری زبان ضُعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان اگر تجھ میں امرءالقیس اور لبید نہیں۔ تو کوئی کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دو جاننے والے

جانتے ہیں۔ کہ شاعری کے لئے اول قدرتی جوہر بعد اُس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی۔ میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں۔ پیادہ ہوں۔ اور نظم میں خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گذارش کرتا ہوں +

شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے

عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
اور ڈالی اُس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو ۴

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے
دولاب چرخ پر مگر اپنا مدار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے

اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
چلتا اسی یہ دور...
اور...

رخصت ہو تو کہ آتی شبِ مشک ریز ہے
پھر صبح اُٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے

۴
آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیبِ رقم کروں
ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں
چمکیگا لشکر اب جو ترا آسمان پہ

عالم میں شاہزادئے مشکیں نسب ہے تو
پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
اُڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
لہرانا پرنیان و حریرِ سیاہ میں
فرماں نشان میں یہ اُڑیگا جہاں پہ

تا صبح ہووے کارگہِ روزگار بند
آرام حکمِ عام ہو اور کاروبار بند

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں

ہر گوہر اُس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

اِس رنگ پر دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے

۴
عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تیری دیکھکر حشم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
بجلی ہنسے تو رُخ تیرا دیتا بہار ہے

ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

ات ہے
ئے

اِس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہے

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر	ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بیخبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے	دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پر اپنے اونگ گیا ہے سوار بھی	چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے	عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں	سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا ۴
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر	بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پہ
کھوئے ہوئے شفق کا نشان زرق و برق ہے	رکھکر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے	سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے جو دکھ درد پا رہے	اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
بار گراں غریبوں نے سر پہ اُٹھائے ہیں	جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے ۴
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

[illegible] ہیں مسافر محنت زدہ بہت	آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر	رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے ۴
اِس وقت اُن بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیر زادے کئی بے نظیر ہیں	مسند کے آسمان پہ بدر منیر ہیں

دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے
پردہ میں شب کے بادۂ گلگوں کا دور ہے

اک گلعذار سامنے سرگرم ناز ہے
اور جام دے رہی نگہ نیم باز ہے

۴ کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
پر دل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں

سامان عیش سب ہیں مہیا کئے ہوئے
جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے

۴ مخمل کا فرش ہے۔ مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت ہیں
آرام ہے نے دئے ہوئے ساماں بہت سے ہیں

دن ہوئے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطف [illegible]
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے [illegible]

اور ان کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے
دن بھر اٹھا [illegible] آفت نصیب ہے

تھا صبحدم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
وہ حق حلال کر [illegible] آیا ہے شام کو

اب اپنی نان خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور مست [illegible] ہے تنو [illegible]

۴ سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے
وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے

بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں

کیجے ذرا خیال کہ ملائے نکتہ داں
بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغ داں

کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی
مضمون جو ہمدگر ہیں الجھتے کبھی کبھی

ہر لفظ کو پنہاتا ہے معنی نئے نئے
لیکن کبھی مقاصد اصلی سے چھوٹ کے
دکھلاتا زور طبع ہے یعنی نئے نئے
کرتا ہے آپ ردّ و قدح جھوٹ موٹ کے

بیٹھا حرام کرکے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو ۵

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور ہے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح امتحان ہے سوا اسکے خیال میں
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے یہ محنت ضرور ہے ۴

اور وہ جو لکھ رہتی ہے مہاجن جہان میں
گنتی میں دام دام کے ہے دم دئے ہوئے
آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
بیٹھا ہے گود میں بھی کھاتا لئے ہوئے

ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے پڑھ نہیں سکتی چھ دام کی ۵

اور دیکھنا نجومیٔ دانا کی شان کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر
گنتی ہے اس کی تارے ہی گنگنا تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں

اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ نو عید ہو ۴

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک اینٹ آن میں ہے

اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹولکر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھولکر

۴
لے جائیگا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئیگا
دیکھو کیا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈالکے
اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر
جاتا زمین کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُر مضمون نئے نئے

۴
مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
یوں خوش ہے جیسے نقش سلیماں مل گیا

اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے
مطلب اڑاتا شعر سے مضمون غزل سے ہے
لاتا پر اپنے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اسکی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضمون کیا ہے جسکا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہے
اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

۴
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دشمن بد بیں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے ۲
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سرِ شام آنکر
اور اُس پہ حق پرست کہ یاد خدا میں ہے
اس کو اُسی کی ذات سے ہے لَو لگی ہوئی

سجّادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
بیٹھا رہِ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے
اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی

کب تک رہے حباب گلا گھوٹ گھوٹکر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
بیٹھے اُسی کی آس پہ ہیں دل دئے ہوئے
بادِ مراد دیتی ہوائے مراد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پہ

اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے
پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پہ

یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر ۲
اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر ۲

دل دے رہا جوشِ محبت کے جام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نکل پڑے

ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
بچہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے

ماں کو تو سوتے جاگتے اِس کا ہی دھیان ہے ۲
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر جائے حیف حال اُسی جاں بلب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے
بتّی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی

سب جس کو کہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی

اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے
اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے

کون اسکا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک
رو ویگا کوئی شام کے مُردے کو کب تلک

آزاد آفریں تری لطفِ زبان کو
پر کروٹ اب ہے رات نے لے دی آسمان کو

سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دئے ہوئے
تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیے ہوئے

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

مثنوی موسوم بہ صبح امید

جب کیا صبح نے روشن فلک مینائی
بستر خواب سے میں لیکے اُٹھا انگڑائی

آنکھ کھلکر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں
ذرہ ذرہ میں نظر آیا رخ جانِ جہاں

کام کرتی تھی جہاں تک نگہ دور انداز
تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرت از

سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ
جس پہ ہے فرش زمیں گلشن گردوں کی شکوہ

برگ برگ اس کا ہے آئینہ لیئے پیش نظر
جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر

آرزوؤں سے کھلے ہیں گل رعنا یکسر
جن سے نکلینگے ثمرہائے تمنا یکسر

قلۂ کوہ کہ تھا چرخ بریں سے ہمراز
رکھتا تھا طول امل سے بھی سوا راہ دراز

تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اُسکی
اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اُسکی

اُس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے
دم اکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے

گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

جشنِ شاہانہ کا ساماں نظر آتا تھا وہاں / سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں

دل اس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے تھے / گویا ذرّے سوئے خورشید اُڑے جاتے تھے

اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا / جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوئے کاہ رُبا پہنچا میں / الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں

دیکھا ایک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں / گل خود رُو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز / رنگِ گل اُس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

بر سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری / نہر بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر ہے بداماں جبل مار رہا / سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگِ مرمر کی لبِ آب جو ایک سِل ہے پڑی / اُس پہ ایک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگِ رخ کو گل گلزار سے چمکائے ہوئے / بیٹھی ایک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

اُس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال / پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے / فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہ تاجوری / ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ / کہ ہر ایک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے / ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے

رخ جو ہے آئینۂ روئے تمنّا اُس کا / شمعساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اُسکا

ایک طرف عقل ہے ایک سمت کو تدبیر کھڑی / آگے جامِ مئے غفلت لئے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا / کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُسکی / پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر ایک سو اُسکی

ہے ہر ایک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے / تڑپ اُٹھتا ہے ہر ایک دل کہ پکارا ہے مجھے

اسکے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے / اپنے دامانِ تمنّا کو ہیں پھیلائے ہوئے

دمبدم ہے جو نسیم سحر آتی جاتی
بوئے امید ہے ایک ایک کو سنگھاتی جاتی

دل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھکو
اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو

دیر تک دل رہا تصویرِ تہِ آئینہ
پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ

غور کی راز نہفتہ میں بہت سی میں نے
شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دونو پر کھولے ہوئے ہے بہ ہوائے اقبال

دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوشحالی
آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی

آؤ تم قید تعلق سے ہو آزاد بہت
اپنی وارستگئ دل میں ہو تم شاد بہت

آؤ یہاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو
لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو

آؤ اِس سایہ میں تم ابر گہربار ہے یہ
یعنی شہزادئ اُمید کا دربار ہے یہ

اُس کے نغمے سے جو یہ راز پرافسوں نکلا
دل سے بے ساختہ یہ مطلع موزوں نکلا

آکہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا
اور مثل ہے کہ بامیّد ہے قائم دُنیا

آکہ ہے تیرے ہوا میں دل شیدا گلشن
لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن

دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا
کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا

کونسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا
کون انسان ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا

کونسا باغ ہے جسمیں کہ صبا تیری نہیں
کونسا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں

کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری
کونسا کوچہ ہے جسمیں کہ نہیں راہ تری

تا ربرقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں وہاں سکّہ ترا چلتا ہے

عہدِ آیندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل
غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل

اُس میں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا
اُسی میدان میں ہیں پھرتے ترے تخمیر سدا

ذرّہ ذرّہ سے ترے اگتے ہیں اشجار مراد
خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزار مراد

جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی
اور ہوا باغ میں ہے خاک اڑاتی پھرتی

چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے
چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے

پیرِ دہقان ہے کہیں بے سروساماں بیٹھا
باغبان خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا

ہوتا اُس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی
نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی

ہاں مگر تو کہ جب اُس وقت میں آجاتی ہے
جلوہ گر باغِ مراد اس کو دکھا جاتی ہے

ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی
پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کرکے دکھا دیتی ہے
کرکے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے

دمبدم تازہ فسوں آکے سُناتی ہے اُسے
باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے

تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھکے وہ
اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یکبار کمر باندھ کے وہ

دھوپیں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا
کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا

ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا
تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اُس کا

اہل ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ
مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ

کوہ و صحرا میں ہیں وہ زاد سفر باندھے ہوئے
اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے

نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا
اٹھ گیا ان کے نصیبوں سے زمانے کا مزا

ہر قدم پہ سرِ راہ خطر ہیں لاکھوں
ایک جوکھو ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں

خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی
صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی

دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ اُن کا
اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا

ہر قدم تو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی
سمتِ مقصود پہ ہے تار نظر باندھ رہی

حسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں
کرسیاں جاہ و مراتب کی سجاتی ہے کہیں

سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے اُنہیں | اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے اُنہیں
کامیابی سے کبھی پھر ہے وطن میں لاتی | آبِ رفتہ کو ہے پھر جیسے چمن میں لاتی
طائرِ دل پر پرِ پرواز ہیں پھیلائے ہوئے | اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازِ استیز | تیغ خونبار کہیں اور کہیں خنجرِ خونریز
ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا | عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا
نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ مُڑ جاتے | بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے
کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے | سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے
پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی | ہاتھ میں ہے لئے ایک شیشۂ بادہ آتی
ایسا مستِ مئے جرأت انہیں کر دیتی ہے | بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
کہ نشہ آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا | سیرِ فانوس خیالی ہے دکھاتا گویا
دیتی ہے چشمِ تصوّر میں ہر ایک کام دکھا | ہے پھر اُس کام کا دیتی اُنہیں انجام دکھا
کہ رُخِ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری | زیبِ سر دیکھتے ہیں تاجِ سپہ سالاری
فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی | پیشِ لشکر ہے پہ سرداری لشکر لاتی
شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے اُنہیں | فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے اُنہیں
نام پر فتح کے نقّارے بجا دیتی ہے | شرق سے غرب تک ایک دھوم مچا دیتی ہے
پرچمِ فتح کبھی لاکے ہے لہرا دیتی | فتحیابوں کے ہے سر پر اُسے جلوہ دیتی
نام ایک ایک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں | اُن کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
سینکڑوں دورِ فلک سر پہ گذر جائینگے | وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئینگے

دیکھتی چشمِ تصوّر ہے یہ جب باغِ مراد | اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغِ مراد

سر بکف برسرِ میداں ہیں دلاور آتے ۔۔۔ اہل جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
جامِ دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں ۔۔۔ نعرۂ اہلِ وغا تا بہ فلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے ۔۔۔ اور ہوائیں بسر چرخ کہن باندھے ہوئے
آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں ۔۔۔ اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
خون دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہ جاتے ۔۔۔ اور جگر سینوں میں خون ہو کے ہیں رہ جاتے
گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں ۔۔۔ کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے منہ کا ہیں نوالا ہوتے ۔۔۔ آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے
فتحیابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے ۔۔۔ اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پر خوں ہوتے
اے امید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے ۔۔۔ یونہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم ۔۔۔ اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالب علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے ۔۔۔ حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال ۔۔۔ ذوق راحت ہے نہ ہے لطف جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح ۔۔۔ بلکہ پیوندِ ورق ہیں جزِ اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے ۔۔۔ ہاتھ اٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں ۔۔۔ دن ہو یا رات انہیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خون جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ ۔۔۔ اور بلا بارِ مشقت کے اٹھاتے ہیں وہ
ان مصائب کی ہے تو ہی انہیں طاقت دیتی ۔۔۔ لطف انجام سے ہے حسن لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا ۔۔۔ دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہل تصنیف کو ہے عمر دوامی دیتی ۔۔۔ بادۂ شوق سے ہے عیش مدامی دیتی
سطح کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے ۔۔۔ برگ و بار اسمیں مرادوں کے لگا دیتی ہے

عوض آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات
اور دکھا دیتی ہے اس طرح سے شاداب حیات
شہرہ گلزار زمانہ میں رہے عام اِن کا
پتے پتے پہ سدا نقش رہے نام اِن کا

کبھی طیار لیاقت کے ہے تمغے کرتی
کہیں ایم۔ اے ہے بناتی کہیں بی۔ اے کرتی
برسرِ کرسی دربار بٹھاتی ہے انہیں
خلعتِ بوقلموں لا کے پہناتی ہے انہیں
بزم کو جلوۂ رنگین ہے دکھاتی اُن کے
اس طرح فخر سے دامن ہے اڑاتی ان کے
ہوتے شاداب ہیں دلہائے فسردہ اُن سے
تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دل مردہ اُن سے
کلفتِ محنت و آفت سے ہیں سب جی جاتے
زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

ایک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا
دشت پُر خار میں ہے بے سر و ساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے
اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے
رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
طپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں
بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثل شرر سینہ میں
دفعتہً آب رواں دور نظر آتا ہے
اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دل سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا
اور خوشی سے تن بےدم میں ہے دم آجاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بےآبی سے
بھاگتا ہے بے سر و پا دوڑتا بےتابی سے
جام ہمت جو اُسے تو نے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں ایک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
نعرۂ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی
اُتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے
دل مایوس کو جب اُس کے یقین آجائے
کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ
سر دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ

یہ سمجھتے ہیں اندھیرا ہو جہاں آنکھوں میں ۔ ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی ۔ صورت نقش قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی میں ہوا اٹکی ہوئی دم سینہ میں ۔ وہ بھی پر ضعف سے آ کر رہے تھم سینہ میں
اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو ۔ سر بالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو
حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا ۔ ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا
اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اسکے لئے ۔ ہوتا ہے قطرۂ آب آب حیات اس کے لئے

کرتے زاہد جو خدا کی ہیں عبادت دن رات ۔ ترک دنیا سے ہیں سرگرم ریاضت دن رات
ذکر فردوس ہیں تو نے انہیں سنوائے ہوئے ۔ لطف ہر دم ہیں ہی پیش نظر آئے ہوئے
رند آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ ۔ بار عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبار گناہ
نہیں جز رحمت حق کوئی سہارا اس کا ۔ تیری ہی چشم کرم پر ہے گذارا اس کا
تو نہ ہووے تو تڑپ کر دل مضطر رہ جائے ۔ وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا ۔ کار ارباب جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا
ہے شب تار تو سونے سے انہیں کام نہیں ۔ دن کو جز فکر مضامین کبھی آرام نہیں
لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے ۔ اور یہ بیٹھے دُرِ مضموں ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے ۔ یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے
باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انہیں ۔ مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انہیں
انہیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے ۔ ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے
کہ جو آہ اُن کے دل سوختہ جاں سے نکلے ۔ یا کوئی نالہ موزوں کہ زباں سے نکلے
اثرِ درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا ۔ اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا

ہووے اس پر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیاد
کہ سخن فہم تہِ چرخ بریں ہوئینگے

قول آزاد سے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد
خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہوئینگے

داد مل جائیگی جب اور کوئی دیکھیگا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھیگا

مثنوی حُبِّ وطن

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی
حبِ وطن ز ملک سلیماں نکوتر است

اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی
خار وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

سلطان دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے
پر ملک مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور

اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے
اس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اور

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حب وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہو
ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

یا ہو گھر جو لوٹنا دریا کے یاد میں
داخل ہو وہ بھی زمرۂ اہل وداد میں

حب وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل دید
آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھر و نمیں عید

آب خنک ہو سامنے اور نان گرم ہو
اور وقت خواب فرش بھی سونے کو نرم ہو

یہ الفت وطن نہیں ہرگز کہ باغ میں
سودا پکائے بلبل شیدا دماغ میں

آخر شکار دام ہو گلشن کو چھوڑ کر
یاد چمن میں جان دے سر پھوڑ پھوڑ کر

حب وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل ہوش
یاد وطن میں ہووے گہے جوش و گہ خروش

بچوں کی طرح روتے سدا زار زار ہوں
اور مادر و پدر کے لئے بیقرار ہوں

اہل و عیال کا نہ گوارا فراق ہو
اور یار کا فراق بہت دل پہ شاق ہو

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے
بی بی کہیں میاں کو بہت مجھسے پیار ہے

روئیں سفر میں دوست گئے یار کے لئے
اور گاہ سیر کوچہ و بازار کے لئے

اے دوست یہ تو دوستی سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آیا یہ دھیان آج جو وقت سحر مجھے
ایک نقل یاد آگئی اس اصل پر مجھے

دلی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے
جو باکمال اس میں ہے وہ بیمثال ہے

ایک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دلی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت و زر اس کے واسطے
اور نقد بہر زاد سفر اس کے واسطے

ہر چند منہ تو دلی سے موڑا نہ جاتا تھا
پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا

مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے
اسباب سارا راہِ سفر کا سنبھال کے

دلی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے
پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے

پہنچے مگر ابھی تھے درِ راج گھاٹ پر
جو دفعتہً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر

دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا ان کا دل
اور دلی چھوڑتے ہوئے بھر آیا ان کا دل

منہ پھیر کر نگاہ جونہی شہر پر پڑی
جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی

تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا
اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا

دیکھا نگاہ یاس سے اور اس سے یہ کہا
پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا

ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں
منہ دیکھکر وہ ان کا ہنسا اور کہا نہیں

پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا
مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا

وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے — اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے

ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے — اُتری ہی زمین پہ جسکی شبیہ آسمان سے

یہ بات اس کی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے — اور بولی خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں — سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں — پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں

اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑیاں پھیر — گر اب پھرے نہ یہاں سے تو قسمت کا جان پھیر

ہم اپنی دلی چھوڑ دکن کو نہ جائینگے — گر یہاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

ایسے ہی ننگ حب وطن بد نصیب ہیں — گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں

کہتے ہیں دکھ اٹھانا ہو یا درد سہنا ہو — تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو

اب میں تمھیں بتاؤں کہ حب وطن ہے کیا — وہ کیا چمن ہے اور وہ ہو لے چمن ہے کیا

وہ رحمت خدا کہ جو بندوں پہ عام ہے — وہ لطف عام جس سے جہاں شاد کام ہے

وہ نور مہر جس سے زمانہ میں نور ہے — وہ نور ذرہ ذرہ پہ جس کا ظہور ہے

حب وطن ہے جلوہ اُسی نور پاک کا — اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

ہو مہر میں یہ نور تو اُس کو کرن کہیں — گر دل سے جلوہ گر ہو تو حب وطن کہیں

رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو — اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو

آوارہ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو — ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو

ہر حال میں رہیں اُسے اہل وطن عزیز — اور ہوویں نیک و بد روش جان و تن عزیز

حب وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ — تاج و سریر ہو کہ نہو بادشاہ ہے وہ

اور حب وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینہ میں — اس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینہ میں

لیکن یہ راز اہل حقیقت سے پوچھئے — اس کا طریق پیر طریقت سے پوچھئے

دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا
ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا

حب الوطن کے راہ میں گرم نفس ہے یہ
نالاں غم فراق سے مثل جرس ہے یہ

یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتا کہاں
بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

جنت سے آئے آدم و حوا زمیں پہ تھے
رکھتے جو قبضہ گلشن خلد بریں پہ تھے

میراث اپنی گلشن جنت کا باغ ہے
حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے

پر آفریں ہے حضرت انساں کی ذات کو
بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو

لیتے وطن پہ قبضہ ہیں دیدیکے جان تلک
آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغ جناں تلک

آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے
تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے

جانا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں
تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں

دنیا زبس کہ مزرعۂ عقبیٰ تمام ہے
سرسبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے

لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے
دانا رموز معرکۂ صلح و جنگ کے

یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے
دونو کے اہل ملک مگر جاں نثار تھے

سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا
دونو کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا

آخر کو تھے جو واقف اسرار سلطنت
سمجھے بہم یہ مصلحت کار سلطنت

دو جاں نثار ملک روانہ اُدھر کریں
اور اپنے دو اِدھر کو وہ گرم سفر کریں

تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں
سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں

جانباز اس طرف کے مگر جان توڑ کر
ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر

ایک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا
یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا

لیکن حریف شرط کے میدان کو چھوڑ کے / بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں / پھر اب کے دو طرف سے واں ایکبار ہوں
پر اپنی بات پہلے ہر ایک شخص جان لے / اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہوئیگا / سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہووے گا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے / حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی / اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وہ ابھی سہی
پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو / سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونو اسی جا پہ اڑ گئے / جینے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

اور ہے لکھا مؤرخ عہد قدیم نے / روما پہ کی جو فوج کشی ایک غنیم نے
تیار اہل فوج پئے کارزار تھے / پر اہل ملک ان سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریب شہر / اٹھے برائے جنگ امیر و غریب شہر
پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا / حب الوطن کے حق میں نیستان کا شیر تھا
نکلا وہ سج کے اسلحۂ جنگ شہر سے / اور لشکر عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثار حبّ وطن اور ساتھ تھے / اعدا کے خون میں ڈوبے سدا جنکے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحر گنگ کا مائی لقب یہاں / تھے ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر / پُل سے اُتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے / اعدا کے خون بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم / حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم
مسمار ادھر وہ کرتے رہے پل کو آنکر / یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر
پُل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا / ایک آدمی کا رھگذر جبکہ رہ گیا

تب کو کلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم
اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم

قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو۔ چھوڑ دو مجھے
تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے

ایک ایک رفیق جب کہ ادھر پار ہو گیا
اور پل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا

للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے
اور ٹائیبر میں کہکے یہ کودا دھڑام سے

ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو
اے میرے باپ بھیجو اپنے سپاہی کو

دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی
اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی

دیکھو تو فیض حب وطن اس کو کیا ملا
جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم
اور ہو بہ تیغ حب وطن دل فگار تم

ایرانیوں کے عہد کیانی کو دیکھ لو
اس بحر سلطنت کی روانی کو دیکھ لو

کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو
کیا کیا عروج دیکے بڑھایا ہے ملک کو

کیا کیا خجل کیا ہے سپہر بنفش کو
کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو

اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں
کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں

ان میں بھی سیستاں کے بہادر وہ شیر تھے
جن سے کہ ایک جہاں کے زبردست زیر تھے

کرتے تھے عیش دامن کوہسار میں کبھی
اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی

مثل غزال دشت میں کرتے کلیل تھے
جنگ پلنگ و شیر انہیں بچوں کے کھیل تھے

آب رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے
تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے

پر سنتے جب کہ شاہ بعزم غنیم ہے
یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے

درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں
ہوں گھر میں یا کہ وادئے نزدیک دور میں

جس حال میں ہوں بے سر و پا اٹھ کے دوڑتے
روے زمیں پہ مثل ہوا اٹھ کے دوڑتے

اوران میں شان رستم دستاں کی دیکھئے
الفت وطن سے شیر نیستاں کی دیکھئے
وہ جس طرف بپھر کے بشکل بلا چلا
بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلہ لا چلا
وہ گرز گاؤ سر کو دھرے فاش زیں پر
لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمیں پر
ریش دوشاخ دوش ہوا پر اُڑی ہوئی
افعی کے پیچ و خم میں وہ مونچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلّہ تھا شیر کا
کرتا فزوں تھا دبدبہ گرد دلیر کا
بر میں وہ چرم شیر کا خفتاں پھنسا ہوا
اور پائے عزم نافِ زمیں میں دھنسا ہوا
پاکھر پڑی ہی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی
اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی
بھانا چھڑانے شاہ کو مازندراں میں
لڑنا وہ دیو دد سے رہِ ہفت خواں میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے
ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دئے
اور دشمنوں کے خوں سے جیحوں بہا دئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا
حب الوطن کے معرکہ میں نام کر گیا

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے
اور لیتا آج تک بھی ہر ایک اُس کا نام ہے
پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے
حب الوطن کے رستم دستان و سام تھے
جب سنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے
یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مست خواب ہوں
یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں
حب الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر
چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
اور معرکہ میں جنگ کے پھر جوشِ عزم میں
گرز و کمند و تیغ سے میدان رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جاں کھوتے تھے
اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
میدان جنگ جیتکے ہمت کے داؤں میں
لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں
چہروں کو رنگ دے کے گلِ نو بہار سے
جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

حب الوطن ہے نور ہیں ہمنور آفتاب
اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب

اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے
ایک جا جو روشنی ہے تو ایکجا اندھیر ہے

آج اس کا آفتاب ہے اوجِ فرنگ پر
اور رات ہند کی ہے رُخِ تیرہ رنگ پر

ہے کچھ حساب اَور وہاں کی کتاب کا
رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا

جانباز ہیں تو بہر وطن جاں نثار ہیں
اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں

قائم ہو تا کہ دبدبہ اہل غرور پر
اور بیٹھے سکہ ملک کا نزدیک و دور پر

وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو
دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت
ہیں دل میں رکھتے مایہ دانشوری بہت

ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں
اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں

تا ہوئے سراب وطن آب جُو نصیب
اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب

شائستگی کے ساتھ رواج کمال ہو
علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں
ہر چند فکر مال میں لیل و نہار ہیں

کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مالُ و جان کو
طے کرتے ہیں بپائے سیاحت جہاں کو

لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکر زر اُنہیں
حب الوطن کا نقش ہے پیش نظر انہیں

کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشے خوشے سے
اور ذرہ ذرہ ڈھونڈتے ہیں گوشہ گوشے سے

چنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول
تا گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول

دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا
اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہل وطن سدا

ایسے بھی آن میں صاحب بخت و نصیب ہیں
دار الشفائے حب وطن میں طبیب ہیں

عالم میں بہر تجربہ پھرتے ہیں گشت کو
ایک ایک قدم ہیں ماپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرّہ ذرّہ چھانتے دریا و کان کا
ہیں برگ برگ دیکھتے باغ جہاں کا
ہیں گاہ ڈال ڈال ہیں گہ پات پات میں
ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں
ایک ایک ورق ہیں صورتِ تحریر دیکھتے
اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے
تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا
اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا

پر ان میں وہ ہے زینتِ تاج و نگیں سدا
اور زیب سر میں اس کے گل آفریں سدا
لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں
آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک
اور غیرت نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا
یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں
تھا مبتلا وہ ایک مرض لاعلاج میں
سب اہل عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے
سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے
پر اس مسیح دم نے جو آکر کیا علاج
ایسا بحسب طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا بکار دعا ہو گئی اسے
اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے
نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں
اور جان تازہ آ گئی ایک ایک کی جان میں
فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا
بحر کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا
ایک جشن عام اُس نے کیا دھوم دھام سے
اور شور تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے
اور اُس طبیب کو کہا بُلوا کے سامنے
لا دامن امید کہ بھر دیں ابھی اُسے
تا عمر پھر نہ پائے تو خالی کبھی اسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا
ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا

حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا
دل آب ہو کے سینہ میں سیماب ہو گیا
کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی
بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی
زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے
پر آرزو جو ہے تو بھی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو
جس سے میرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے
جو مانگنا ہے مانگ تجھے اختیار ہے
تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے
روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی سی زمیں نواحئے دریا کنار میں
مجھ کو عطا ہو مملکت شہریار میں
تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں
اور اُن میں تاجران ذوی الامتیاز آئیں
کچھ اُن پہ ہووے راہ نہ بیم زوال کو
آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دُور سے
محصول سب معاف ہو اُس کا حضور سے

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اُس کی بھی یعنی کلفتِ غم دور ہو گئی
اور نفی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہر چند اُسے نہ فائدہ سیم و زر ہوا
پر نفع بہر اہل وطن کس قدر ہوا
دامن میں ایک عطائے خداداد پڑ گئی
اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی
آواز دینگے طبل مگر اُس کے نام کی

اے آفتاب حبّ وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظام دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہل درد ہیں دل مردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں تیرے جوش ہو گئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے

حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں

کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں

بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں

کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

عالم سے تاکہ تیرہ دلی دور ہو تمام
پنجاب تیرے نور سے معمور ہو تمام

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں
اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریز جوشِ حبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

مثنوی خواب امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا
دل نے بھی کرسیٔ آرام پہ آرام لیا

میں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا
مکتبِ دید کا پر شائق ناخواندہ تھا

دمبدم دورِ فلک تازہ سبق تھے گویا
رات دن مجھ کو زمانے کے ورق تھے گویا

شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں
اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں

بود و نابود جو نظروں میں تُلے جاتے تھے
معنیٔ کون و فساد اُس میں کھلے جاتے تھے

دفعتہً سامنے لیلائے شبِ تار آئی
کرتی ایک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی

گرچہ لائی تھی نہ سامان مے و مینوشی کا
ہاتھ میں شیشہ تھا پر دارو ئے بیہوشی کا

چال سے سرمۂ حیرت کے غبار اُڑتے تھے
حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اڑتے تھے

ایسے انداز سے دامن تھی ہلاتی آتی
سب کو تھی امن کے سایہ میں سلاتی آتی

اُس کا جھوکا ہؤا غفلت کا حجاب آنکھوں پر
خواب شیریں نے کیا کار نقاب آنکھوں پر

خواب گو کارِ جہاں میں خلل انداز ہؤا
پر خیالاتِ دلی کو پرِ پرواز ہؤا

ذوق گلگشت کا ایک دیکے اشارا مجکو
ایسے گلزاروں میں لیجا کے اُتارا مجھکو

کہ نہ تھا فصل بہاری پہ سہارا اُن کا
تھا چمن بند طبیعت چمن آرا اُن کا

اُس قلمرو میں رواں تھا قلم امن و اماں
پتے پتے کے ورق پر رقم امن و اماں

پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا
موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا

سرکشی سروِ سرافراز دکھاتے ہی نہ تھے
سینہ زوری کے بگولے ادھر آتے ہی نہ تھے

زلفِ سنبل کی سیاہ تھی پہ سیاہ کار نہ تھی
خم تو تھے اُس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی

سرِ شمشاد کا طرہ وہاں طرّار نہ تھا
شوخئِ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا

دھوپ کا رنگ چمکتا تھا تو ڈھل جاتی تھی
اور نسیم آکے دبے پاؤں نکل جاتی تھی

صبح یہ تاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے
یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے

پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی
ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی

ہنستے تھے پھول پہ کھُلتی گرہ راز نہ تھی
لوٹ جاتے تھے نکلتی مگر آواز نہ تھی

مرغ وہاں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے
اور شجر موجِ ہوا میں پڑے لہراتے تھے

برگ سے برگ ولیکن نہ کھڑک سکتا تھا
خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا

لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے
سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے

باغباں قدرتِ حق کا تھا جو آیا اُس جا
تختۂ ایک تھا گل خود رو کا لگایا اُس جا

دامن کوہ سے چشمہ جو ہؤا تھا جاری
آب شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری

اس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لب جو کی بہار
اور لب جو پہ وہیں سبزۂ خودرُو کی بہار

شیر بکری وہاں ایک گھاٹ تھے پانی پیتے
جام اُلفت تھے بہم دشمن جانی پیتے

جلوہ گر بیچ میں ایک قلعۂ شاہنشاہی
گنبد امن تھا یا گنبد بسم اللّٰہی

درو دربان کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں
پاسباں امن کا دن رات تھا ہشیار وہاں

خسروِ امن کا دربار

میں کہ آشوب جہاں سے تھا ستمدیدہ بہت
امن کو سمجھا غنیمت دل غمدیدہ بہت

شوق دل لیکے غرض قصر میں آیا مجھکو
پر عجب عالم نیرنگ دکھایا مجھکو

خسروِ امن تھا وہاں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار

اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گل خورشید تھا وہاں ہر گل شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادر مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہیں ہر دم آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار
کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار

دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

۴ شغل میں اپنے ہر ایک شخص تھا مشغول وہاں
چُنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

علم امن کا شکریہ کرتا ہے

دفعۃً دیکھا کہ ایک پیر کہن سال آئے
پر عجب شان سے وہ مرد خوش اعمال آئے

جسمِ پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملہ دستار جو آجاتا تھا
اُن کی مقدار فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریش مقدس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے آتے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے
پہلے سب نے بادب دست دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے
علم نے بھیجا ہے تقدیم رسالت کے لئے

اہل تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا
ہے ہر ایک شہرتِ تعریف سے معروف سدا

اہل تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہاں میں انہیں فکر سحر و شام نہیں

دمبدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کارگہ دہر میں اُستاد نئے

درس و تدریس کے چرچے جو ہیں گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیت خاطر کی ہی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئے موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہ امن یہ سب فیض کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ کرتی ہے

تھا انہوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا
اور نہ تھا علم نے طور مار لپیٹا اپنا

دیکھا انبوہ ہے ایک حد سے زیادہ آتا
ہے سوار اُن میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑیاں آگے سواری ہیں بچھیرے پیچھے
اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گود میں ہے کوئی گوسالہ اُٹھائے آتا
کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آئے ہیں
نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے لائے ہیں

ٹھڑے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے
بالیں گیہوؤں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں اُن کے
تندرستی کے نشاں منہ پہ عیاں ہیں اُن کے

دیکھ انہیں سب علما ہٹ کے کنارے آئے
بے تکلف سر دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہِ امن و امان
تجھ سے جاری ہے زمانے میں وہ امن و اماں

کرکے طے گرچہ بہت فرسخ و میل آئے ہیں
جانب اہل زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے
آسرے کتنے ہیں دن رات بچارے تیرے

کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں
گھر میں ہیں تو ترے شکرانے ادا کرتے ہیں

تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے
خاک پر آبِ زمرد کو بہا جاتا ہے

کشت امید زمانہ کی ہری ہے تجھ سے
سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے

پیر دہقاں کہ جو ہے سایہ میں تیرے بیٹھا
جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا

سایۂ امن ترا اُس کو ہرا رکھتا ہے
صرصر فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانے کی لگدکوبی سے
ترکتازانِ حوادث کی پُرآشوبی سے

فیض رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اُسے
زور تیرا ہے کہ زر کرکے اُٹھاتا ہے اُسے

کرنا خدمت ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو
تو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو دانوں کو

تو نہ ہو وے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلقِ خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن ان کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی
اور زراعت نے یہ خرمن نہ اٹھایا تھا ابھی

لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں
دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں

گرچہ حال اپنا زبان سے نہ بتاتے تھے وہ سب
مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب

کہ ابھی قطع کئے راہ سفر آئے ہیں
ریل سے یا کہ جہازوں سے اتر آئے ہیں

تھا کوئی دوش پہ جو چیں اٹھائے آتا
اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا

رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلود
دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلود

دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لئے
تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پئے شاہ لئے

خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ
بعدِ آداب زباں پہ یہ سخن لائے وہ

اے شہِ امن دعا خلقِ خدا کرتی ہے
اور تجارت تیرا شکرانہ ادا کرتی ہے

کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری
شرق سے غرب میں جنسیں ہیں پہنچتی ساری

ہم اٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام ان سے
اور جو گھر بیٹھے ہیں وہ پاتے ہیں آرام انسے

کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے
کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے

رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہیں
شیر کنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہیں

نہیں اصلا خطرِ رہزنئے دہر انہیں
ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انہیں

کوئی دم لیتا ہے رستہ میں کوئی سوتا ہے
پر کہیں کیل کا بھی کھٹکا نہیں ہوتا ہے

اے شہِ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو
اور تیری نظم پہ عالم کا سرانجام نہ ہو

ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جائے
خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات ان کی ابھی ختم پہ آنے پائی
لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے
جیسے تختہ ہو گلِ بوقلموں کا آتا
خاک پر تھے گلِ ایجاد لگاتے آتے
دستکاری نے کیا لعبتِ چین تھا ان کو
چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر
تھے لئے نذر نہ کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں
غرض آکر سرِ تسلیم جھکائے سب نے
کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا
اے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا
دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے
تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا
کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں

اور تجارت پہ دکاں تھی نہ بڑھانے پائی
لیکن اس رنگ سے وہ داخل دربار ہوئے
یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا
پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے
رنگ چمکا کے کیا نقش نگین تھا ان کو
ضعف بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر
دستِ صنعت کے تھے گلدستہ نئے ہاتھوں میں
پیشکش لیکے جو آئے تھے دکھائے سب نے
تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا
کہ اسی سائے میں اپنا بھی ہے بازار کھلا
کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے
ریل کا تختِ سلیماں ہے اڑائے جاتا
اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں

ٹیپ

اے شہِ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری
دفعتہً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر

زیرِ تقریر یہ تھے کر رہے میناکاری
ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر

جیسے جھڑتے کبھی گلبن سے ہیں گلزار میں پھول
چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول

کہ پری اتنے میں ایک دوشِ ہوا سے آئی
آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی

حسن رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اڑتی
جامۂ امن تھی فقط چادرِ مہتاب اڑتی

حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اُس کا
پر سراپا تن نازک تھا طلائی اُس کا

ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اُڑاتی چلتی
باغ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی

تھی نہ تھمتی روشِ گردشِ ایام ایک جا
لینے دیتی نہ تھی شوخی اُسے آرام ایک جا

جب کہ وہ غیرتِ نورِ سحری آ پہنچی
پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہِ امن کے جس دم آئی
حسنِ شکرانہ میں یہ نغمۂ دلکش گائی

کہ جہاں تیری بدولت ہے ہر ایک حال میں خوش
ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش

گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا
خوش ہے دو پیسے کی مزدوری میں مزدور سدا

زیردستوں کو ترے سایے میں خوش مستی ہے
اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبردستی ہے

ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا
مار کیا تاب جو بل مارے سرِ مور ذرا

بند دستوں کو خطر کچھ نہیں نقصانوں سے
ہاتھ میں دستِ درازی کے جدا شانوں سے

ہے ترے نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
شربتِ عیش سے معمور ہے جامِ عالم

فتنہ انگیزی عذر و آشوب کی

تھی پری زمزمۂ شکر سے دمساز ابھی
کہ عیاں جانب صحرا سے ایک آواز ہوئی

وہ صدا سنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ
اور ہوا ہو گیا یکسر گل و گلزار کا رنگ

اہل دربار کہ تھے بزم جمائے بیٹھے
غم و افکار سے ہاتھ اپنے اُٹھائے بیٹھے

مضطرب ہوکے ہر ایک جانب آواز چلا
چلتے چلتے غرض ایک دشت نظر آیا ہمیں
یعنی ایک مرد دلاور ہے سرِ کوہ کھڑا
تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رخسار اسکے
بدن اینٹھا ہوا ابھرا ہوا سینہ اس کا
خسروِ امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اس کی
نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب پہ نظر ڈال رہا
اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ
آؤ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو
کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہے تمہیں
رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں
خواب غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے
جرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں
خسروِ امن کی خدمت میں جو جیتے ہو
اس عمل نے ہے جوانی میں کیا پیر تمہیں

مرغ دل میرا ابھی کھولے ہوئے پر پرواز چلا
ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں
اور سرِ کوہ ہے گرد اس کے ایک انبوہ کھڑا
لال انگارے ہیں دو دیدۂ خونخوار اس کے
کہ سدا مشق مشقت ہے قرینہ اس کا
کودا گھوڑے سے ہے اور پکڑے ہے خود باگ اسکی
ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا
آؤ اے راحت و آرام پسندو آؤ
جام جرأت خم ہمت سے پلائیں تم کو
نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہے تمہیں
دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں
ہمت و عزم بھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے
ملک میں زورِ ترقی کا کہیں نام نہیں
رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو
کیا ہے قید نے وابستۂ زنجیر تمہیں

آؤ اس قیدِ بلا سے تمہیں آزاد کروں
زورِ بازو سے تم آفاق کو تسخیر کرو
عیش نے ہی جو تمہیں جاں سے مجبور کیا
کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں
ہیں جہانگیر و جہانگرد کرونگا تم کو

اور ابھی صاحبِ اقبال خداداد کروں
دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو
ضعفِ دل نے تمہیں ہمت سے معذور کیا
اور کیا بسترِ راحت کا ہے پیوند تمہیں
مرد اگر ہو تو جوانمرد کرونگا تم کو

ماپ ڈالو گے نہیں قدموں سے میدانِ جہاں
ایک کر دو گے ابھی دشت و بیابانِ جہاں

اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے
ملک کا نام زمانہ میں ڈبویا تم نے

میں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچاؤنگا
مثل خورشید جہاں میں تمہیں چمکاؤنگا

گرچہ تھا خلق میں آشوبِ جہاں نام اُس کا
فتنہ انگیزیِ عالم تھا سدا کام اُس کا

پر نشۂ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے
گنبدِ امن میں آرام سے سونے والے

گرم و سرد اُن پہ زمانہ کے نہ گزرے تھے کبھی
گود سے دایۂ راحت کے نہ اُترے تھے کبھی

لایا تھا پیچ میں اپنے نہ کبھی غدر انہیں
اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں

اس کی جانب قدمِ شوق بڑھائے سب نے
اور ادب سے سرِ تسلیم جھکائے سب نے

یعنے ہم تابع فرماں ہیں جدھر جائیے آپ
جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ

ان میں یہ کوتہی فہم جو پائی اُس نے
مکر کے ہاتھ کو دی اور رسائی اُس نے

پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو
جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سنایا اُن کو

کہ شہرِ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک
ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک

اور مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور
چاہیئے میری رفاقت تمہیں اکبار ضرور

سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں
اور جہاں آپ قدم ماریئے ہم حاضر ہیں

یہ سخن سنتے ہی ایک قہقہہ مارا اُس نے
اور کیا شہر کی جانب کو اشارا اُس نے

دوڑ کر جست کی اور زینتِ رہوار ہوا
آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرر بار ہوا

شہر کی سمت کو رخ اس نے دلیرانہ کیا
ایسا للکار کے ایک نعرۂ شیرانہ کیا

ہل گئے صدمہ سے جس کے طبقِ خاک تمام
تھرتھرانے لگے نہ گنبدِ افلاک تمام

یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا
دفعتہً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کھل گئی آنکھ تو تھی شام سیہ فام وہی
وہی آزاد تھا اور کرسیِ آرام وہی

مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف

تھا دلِ آشفتہ جو شب گردشِ ایام سے میں
ہو کے بے خواب اُٹھا بسترِ آرام سے میں

دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کی بیزار مرا
اس کے بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا

جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں
اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں

جیب میں عقل کی کنجی کو ٹٹولا میں نے
اور کتب خانۂ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا
یا کہ رودادِ زمانہ کا ایک آئینہ تھا

کتبِ عہدِ قدیم اُس میں سجائی تھیں بہت
عہدِ آیندہ کی تصویریں لگائی تھیں بہت

بہت اوراقِ پریشاں کہ بہم تھے ان میں
ماضی و حال کے احوال رقم تھے اُن میں

تھے پڑے دفترِ تاریخ کے اخبار بہت
اور نسب ناموں کے پھیلے ہوئے طومار بہت

اُنھیں اوراق میں ایک مجھ کو نسب نامہ ملا
کہ عجب مخزنِ اسرار پئے خامہ ملا

سر بسر تھے رقم احوال نکو فال اُس میں
خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اُس میں

صدق روشن گہرِ آفاق میں تھا باپ اُس کا
چہرہ پر باپ سے روشن تھا سوا آپ اُس کا

تھا نسب اُس کے بزرگوں کا یقیں سے ملتا
حق و واقع کا بھی رشتہ تھا یہیں سے ملتا

ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتا ملتا تھا
رفتہ رفتہ یونہی ایمان سے جا ملتا تھا

ماں کی جانب میں دیانت کا تو فرزند تھا وہ
اور امانت کے کلیجہ کا جگر بند تھا وہ

دانش و داد نے دودھ اپنا پلایا تھا اُسے
حسنِ اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اُسے

اُس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے
ملکِ دل خورمی و عیش سے آباد ہوئے

بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اُسے
تا کہ دنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اُسے
یہاں ادب نے اُسے شائستہ و دلخواہ کیا
علم نے اُس کو ہر ایک راز سے آگاہ کیا
کر چکے علم و ادب جب کہ ادا حق اپنا
اور فضیلت نے کیا نائبِ مطلق اپنا
ملک القدس کے دربار میں تب لائے اُسے
کہ معزز کیسے اعزاز سے فرمائے اُسے

سرِ دربار بصد حسن و ادب آیا وہ
ایسے آداب سے تسلیم بجا لایا وہ
کہ شہِ قدس اُسے دیکھکے خورسند ہوا
اور ہر ایک حاضرِ دربار رضامند ہوا
دونو اُستاد و اتالیق تھے ہمراہ آئے
باندھکر دستِ ادب روبروے شاہ آئے
کی یہ پھر عرض کہ تو خسروِ نورانی ہے
اور تجھے عالمِ بالا کی جہانبانی ہے
چاند یہ اوجِ حکومت پہ جو چمکا ہے ترے
ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے
اے شہِ قدس ہے مدنظر حال اِس کا
ایسا چمکا ئیو تو نیّرِ اقبال اس کا
کہ فزوں مہر سے ہو جاوے درخشانی میں
حکم ہو اس کا رواں کشورِ انسانی میں

حال یہ علم و ادب نے جو سب اظہار کیئے
اور قیافہ نے بیان اُس کے سب اطوار کیئے
خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا
خلعت و عزت و عظمت سے سرافراز کیا
اپنے اعزازِ دوامی کا دیا تاج اُس کو
اور دعاؤں سے کیا صاحبِ افواج اُسکو
مشتری نے دیا عزت کا عمامہ اپنا
اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا
لقب خسروِ انصاف اُسے ارشاد کیا
اور روانہ بسوے کشورِ ایجاد کیا
کہ ہوا ملکِ فنا ہے جو خرابات تمام
ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جا کے آفاق کو تم نور سے پُر نور کرو
اور خرابات جہاں عدل سے معمور کرو

نسخہ سیرِ خیالی تھا سر دست ابھی — اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار میرے — نیند نے بند کئے دیدہ بیدار میرے
چھائے ایسے یہ تصور دل بیتاب میں تھے — کہ جو تھے دل میں خیالات ہی خواب میں تھے
اس تصور نے غرض سیر سے اڑایا مجھکو — دفعتہً ایسے بیابان میں لایا مجھکو
وہم شاعر کی جہاں بات بھی پہنچے نہ کبھی — وسعتِ فرضِ محالات بھی پہنچے نہ کبھی

یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے — اور تمام ارض و سما مطلع انوار ہوئے
بقعہ نور کا ایک تخت ہوادار اُترا — کہ جہاندار زیبِ عالم کو جہاندار اُترا
تھا جلال اُسکے یہ چہرے کی درخشانی میں — چلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابش انصاف کی پائی نہ کہیں — اور ہوئی اس کے تجلّے کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابر کرم سامنے ڈالے اُس نے — مگر اس پردہ میں وہ رنگ نکالے اُس نے
کہ ایک آرام سا آنے لگا بینائی کو — اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالم قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں — بند و بست اُن کو جو درکار تھے فرمائے وہاں
جب کہ ساماں ہوئے سب بزم شہنشاہی کے — اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تا ماہی کے
تو رشحہ عدل، ہوا جلوہ نمائے عالم — معتدل ہو گئی ہر پہر کی ہوائے عالم
ضعف و قوت بڑھے انداز سے یکساں آگے — اور کھڑی ہو گئی انصاف کی میزان آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تل جائیں ابھی — نیک و بد جو ہوں زمانہ میں وہ کھل جائیں ابھی
یاس و اُمید کھڑے سامنے منہ تکتے تھے — رعب سے شاہ کے پر بات نہ کر سکتے تھے
لی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُسنے — اور پیدایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے
چہرہ پر رعب خداداد برستا تھا پڑا — حسن خلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا
تھا لئے ہاتھ میں ایک تیغ شرر بار عجیب — اس کے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب

کاٹے میں بال کا چھوڑے نہ پس و پیش ذرا | اور نہ ہو تول میں تِل بھر کا کم و بیش ذرا
دوسرے ہاتھ میں فانوس فروزاں تھا لئے | یا پئے جور و ستم آتشِ سوزاں تھا لئے
گرچہ فانوس میں تھی اس کے ہر ایک بات نئی | نور فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی
یعنی اصلیت اشیا کو دکھا دیتا تھا | نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کھلا | دل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کھلا
حق و اثبات چپ و راست وزیر اُسکے ہوئے | ذہن و ادراک و قیاس آکے مشیر اُسکے ہوئے
مصلحت باندھے ہوئے عہد و وفا تھی اُس سے | ہوتی تدبیر نہ ایک آن جدا تھی اُس سے
قہر ایک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا | رحم پر آب کرم آکے چھڑک جاتا تھا
یمن و اقبال نے چمکایا وقارِ دربار | اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

کر چکے نظم و نسق آکے جو سب تیاری | تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری
کہ جو مظلوم ستمدیدہ بچارے ہوویں | اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں
برسرِ داد پئے انصاف ابھی لائیں انہیں | تا کہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں انہیں

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی | اشتہاروں کی زباں سے وہیں مشہور ہوئی
کی پر اس حکم نے دنیا تہ و بالا گویا | بلکہ گھر گھر عجب ایک تہلکہ ڈالا گویا
یاس و آس کے اور شادی و ناشادی کے | تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے
تو جسے دیکھتی تھی اُس کو لگی تھی اپنی | پڑ گئی تھی غرضِ ایک ایک کو اپنی اپنی
تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام | آن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام

ہوئے اس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں / ہوگیا حشر کا میدان بیابانِ جہاں

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری / اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری

کہ جدا ہوویں ہر ایک فرقہ کے اشخاص الگ / تاکہ احکام میں بھی عام سے ہوں خاص الگ

جب کہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا / تو گریباں ستم دستِ اجل میں آیا

پہلے ایک فرقہ طلب بہ سرِ دربار ہوا / حکم دربار سے اس طرح سے اظہار ہوا

کہ جو قبضہ میں ہو حقیّت و املاک کوئی / نقد یا جنس جہاں ہو تہِ افلاک کوئی

اُس پہ دعوے جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی / اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی

حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوئے دربار بہت / کھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت

آل تمغا تھے یہ طغرائے سلاطین سلف / اور مطلّے و مزیّن تھے بہ آئین سلف

بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے / سینکڑوں مُہر و شہادت کے حوالے آئے

پر نظر جب شہِ انصاف نے ڈالی اپنی / تو وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی

پھر شہادت کوئی پوچھے نہ گواہی دیکھی / اور نہ مُہر و توزکِ دفترِ شاہی دیکھی

جو جو اسناد کہ در پیشۂ انصاف میں تھے / تھے کھلے یا کہ دھرے گوشۂ اطراف میں تھے

انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا انہیں / یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا انہیں

تھے وہیں زیرِ بغل یا کہ مکانوں میں چھپے / اور مکانوں میں بھی صندوقوں کی خانوں میں چھپے

روشنی پڑتے ہی احوال عیاں ہوگئے سب / جعل کے حرف جہاں تھے وہ دھواں ہوگئے سب

جعلسازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم / مکر و تزویر کے پرچے وہیں دوڑائے بہم

آئی دولت بھی مگر اس کی رسائی نہ ہوئی / اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی

طرفہ تر لطف یہ لیکن سرِ دربار ہوئے / کہ بیکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے

بے نوا ئے تھے جو وہ اُمرا ہو گئے سب
جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب

الغرض حق کو پہنچکر جو یہ حقدار آئے
تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے

کہ خطابوں نے بنایا تھا سرافراز انہیں
دیتی القاب تھی سرمایۂ اعزاز انہیں

ان میں وہ لوگ کہ جو صاحبِ پندار بھی تھے
تن پہ چمکائے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے

خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا انہیں
یا کہ دولت کی ہواؤں نے اڑایا تھا انہیں

سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے
عَلَمِ فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے

پر جب انصاف نے فانوس اٹھائی اپنی
چاندنی پر تو انصاف نے چھائی اپنی

تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے
اور کئے کارِ نمایاں تو وہ بے کار رہے

کارناموں سے رہے خلق میں گمنام سدا
کام سب ان کے جہاں میں گئے ناکام سدا

اب وہ رُخ پہ تو اعزاز سے چمکانے لگے
اُن کے سر پر علم اقبال کے لہرانے لگے

پر جو دربار میں آئے تھے سرفرازی سے
اب بھی باز آئے وہ ظالم نہ فسوں سازی سے

لائے تدبیر کو مطلب کی گذارش کے لئے
چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لئے

حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی
اُن کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی

اُن کے بعد اور ایک انبوہ نمودار ہوا
پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوا

تھے بہت زیرِ کلہ نخوت و بیداد لئے
اور بہت زیرِ بغل خنجرِ بیداد لئے

سینہ زوری نے نہیں سینوں میں تھے زور دئے
شور پشتی نے انہیں تھے سرِ پُر شور دئے

سینکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخمور اُن میں
اور بہت زورِ حکومت سے تھے مغرور اُنمیں

بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ انہیں
اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر ایک شاہ انہیں

ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد انکی
کسی دربار میں سنتے تھے نہ فریاد اُن کی

اُن کے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے
عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے

جو ستم اُن پہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے
لب تلک نالۂ پُر درد کو لا سکتے نہ تھے

پر جو تھا خسروِ انصاف کا دربار یہاں
اور نہ تھا رد و رعایت سے سروکار یہاں

یا تو ہر معرکہ میں تھے وہ ستمگار آگے
یہاں مگر ہو گئی مظلوم دل افگار آگے

روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُن کے
خود بخود کھل گئے سب فترِ اعمال اُن کے

دستِ ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے
بلکہ جو ظلم کئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے

قہر سے کی جو شہِ عدل نے یکبار نگاہ
ہوئی اس طرح سے اُن سب پہ شرر بارِ نگاہ

کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے
اور ہوا سے دمِ رفتار جھگڑتے آئے

جامے جل جل کے وہ سب ننگے سر خاک گرے
اور لفافوں سے نکلکر جو وہ بیباک گرے

رعب سے خسروِ انصاف کے تھرانے لگے
سب کی سب صورتِ روباہ نظر آنے لگی

شہِ انصاف نے اُس دم یہ صدا دی سب کو
اور منادی نے وہیں آکے ندا دی سب کو

کہ جو زیر ان سے تھے اب تک وہ دلیر ان پہ رہیں
اور مسلّط وہ سدا صورتِ شیر ان پہ رہیں

لوگ کچھ زمرۂ اعزاز میں وہاں اور آئے
پر جو دیکھا تو نظر اُن کے عجب طور آئے

علما و فضلا و بلغا تھے سارے
اور بھرے سر میں فضیلت کی ہوا تھے سارے

تھے بہت جبّہ و عمامۂ شالی رکھتے
اور بظاہر تھے مُٹاپے کی بحالی رکھتے

روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے دن رات پڑے
مفت خورتی میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے

سر پہ دستارِ مشیخت کی بہت بھاری تھی
اور شکم خالی کتابوں کی ایک الماری تھی

تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت
کہ لگدکوبِ مشقّت سے تھے پامال بہت

شمعسان آتشِ تصنیف میں گھلتے تھے سدا
پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رُلتے تھے سدا

تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی کے
اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے

پر جو نا منصفیٔ دہر نے مارا تھا اُنہیں
سخت دشوار زمانہ میں گذارہ تھا اُنہیں

غرض انصاف نے جب پرتو ڈالا اپنا
مل گئے خاک میں اعزاز خیالی سب کے

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے
بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ
فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا اُنہیں
دیتے جاروب سر خاک تھے جامے اُن کے
سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے
کیا پیری نے تھا روشن رخ نورانی کو
پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں انہیں
تھے مگر اس پہ بھی ایک ایک سے آگے جاتے
کہ زمانہ کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے
آئے دنیا کے نہ افسون فسانہ ہیں کبھی
آج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں
جب کرامات یہ ایک ایک نے سنائی اپنی
معرفت شمع فروزاں لئے یکبار آئی
مکر و تزویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں
یہاں جو دیکھا تو حریف سے وہ بیتا نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا

رنگ تب مغز اصلی نے نکالا اپنا
جل گئے خلعت زرینہ و شالی سب کے

زہد و تقویٰ و ارادات سے با خلاص آئے
خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ
خرقہ پوشی نے مرقع میں سجایا تھا انہیں
چھتریاں سر پہ لگائے تھے عمامہ اُن کے
عرض حال اپنے وظیفوں میں سُناتے آئے
اور نشاں سجدہ کے چمکاتے تھے پیشانی کو
تا بدر بار بھی سو عذر تھے آنے میں اُنہیں
اور یہ کہتے سوئے دربار تھے بھاگے جاتے
اور کچھ آرام نہ دنیا کا اُٹھایا ہم نے
اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی
بخشئے تاج کرامت سے سرفراز ہمیں
شہ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
کرتی اصلیت اشیا کو نمودار آئی
کھل گئے زہد خدائی و ریائی سارے
بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سُنا نام نہیں
اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
نان و نفقہ کی طلبگار بیچاری دوڑیں
پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا

علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا
بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا

سند علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے
خوانِ معنی سے تھے البتہ بہ بصر سے پانے اپنے

قتلِ مضمون تھا زمانہ میں فقط کام اُن کا
نکتہ چینی سے تھا مشہور جہاں نام اُن کا

گرچہ شورش کے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے
رو سیاہی میں تھے منہ کو چھپائے ہوئے تھے

الغرض بڑھکے وہ جس دم سرِ دربار آئے
لوگ اُنہیں دیکھتے ہی جوش میں یکبار آئے

اور یہ چلّائے کہ ہے علم سے کیا کام انہیں
مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انہیں

کوئی تصنیف ہو اُن کی تو دکھا دیویں ذرا
ہو جو تقریر کا دعوےٰ تو سنا دیویں ذرا

سُنکے اس بات کو اُن کے بھی ہوئے کان کھڑے
سامنے تخت کے گھبرائے ہوئے آن کھڑے

سونچکر ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر
تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم
پڑھ کے پر سنانے میں ہیں آندھی کو بھی کم مانتے ہم

یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں پاتے آن ہمیں
اس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں

ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں
کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں

سن کے اس بات کو ایک قہقہہ مارا سب نے
اور کہا کاغذوں پر کرکے اشارہ سب نے

کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لے جاؤ انہیں
اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ انہیں

لوگ اتنے میں بانبوہ کثیر آئے بہت
اہلِ دربار اُنہیں دیکھکے گھبرائے بہت

کتنے کچھ آپس میں شور کرتے ہوئے تکرار آتے
غل مچاتے ہوئے سب کے سب سوے دربار آتے

اہلِ سیف اہلِ قلم شامل حال اُن میں تھے
اور بہت تجربہ کار اہلِ کمال اُن میں تھے

اُن کا غل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا
شہ کا تب حکم یہ ایک لیکے پیادہ پہنچا

کہ ادب شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو
کیوں ہیں غل اتنا مچاتے انہیں خاموش کرو

اہلِ سیف آگے بڑھے تیغ زباں تولے ہوئے
پیشقدمی کے لئے اہل سے علم کھولے ہوئے

ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا
کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے

لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا
میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے

سامنے چیختے تھے دشمن بدکیش میرے
رہے ناکام سب اعداے بداندیش میرے

مثنوی موسوم بہ وداعِ انصاف

جب طورِ دمِ صبح شبِ تار کا بدلا
اور رنگ چمن میں گل و گلزار کا بدلا

شبنم نے گہر فرش کئے خاک کے اوپر
اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے
اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے

آئے جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں
انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ
لی خاک پہ یہاں مستِ خرابات نے کروٹ

زاہد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا
اور بیٹھا مصلّے پہ زمیں چوم رہا تھا

بیدار ہوا سن کے مؤذن کی اذان کو
آزاد جو تھا صرفِ سخن کر رہا جان کو

ہشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے
اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیضِ سحر سے ہو دلِ زار شگفتہ
اور ہو کوئی دمِ جانِ پُر آزار شگفتہ

پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا
اور قلزمِ افکار کی میں لہر سے نکلا

دیکھا کہ سوئے دشت ہے دنیا چلی جاتی
اور خلق ہے دوڑی ہی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت ہوئی میرے دلِ بیتاب و نواں کو
اور پوچھا ہر ایک شخص سے اس ازِ نہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے
اس پردۂ حیرت کو اٹھایا نہ کسی نے

آخر کو نظر عقل نظرباز سے لے کر ۔ اور شوق کے بازو پر پرواز سے لیکر
پابند بر فتار زمانہ ہوا میں بھی ۔ ساتھ اُن کے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی
جب شہر کے میدان سے ہم دور تر آئے ۔ اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے
دیکھا کہ سر راہ کچھ اشجار ہرے ہیں ۔ دامان تمنا کو طراوت سے بھرے ہیں
ایک شاہ اُسی جا بہ سرِ خاک ہے بیٹھا ۔ بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا
اور سامنے کچھ باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں ۔ کچھ برہنہ سر اور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں
وہ آکے گرے پاؤں پہ با دیدۂ تر ہیں ۔ اور عفوِ جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

پر شاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے ۔ اور افسر شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے
دیکھی جو یہ روداد تو حیران ہوا میں ۔ جب حد سے سوا دل میں پریشان ہوا میں
ایک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے ۔ اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے
وہ ہو رہے سب مضطر و ناچار تھے ایسے ۔ اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے
آتی تھی کسی میں نہ نظر بات کی حالت ۔ تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

ایک پیر کہن اتنے میں نزدیک تر آئے ۔ اور ہوش بھی کچھ اُن کے ٹھکانے نظر آئے
یہ عقدۂ سر بستہ رکھا سامنے اُن کے ۔ کھولا یہ معمّے لبِ ناکام نے اُن کے
یعنی کہ ہے یہ شاہ شہنشاہ مروت ۔ تھی اس سے زمانہ میں رواں راہِ مروت
اب اس نے جو دیکھا کہ ہے ننگ و رہیان کا ۔ ایماں ٹھکانے نہ رہا اہل جہاں کا
دنیا میں ہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیت ۔ اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا ۔ اور سلطنتِ خلق سے منہ موڑ کے اپنا
ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو ان کے ۔ تا ان کی سزا سونپ کے اعمال کو ان کے

اور سب کو سہارا ہو خداوند جہاں کا　　اُس بن ہو گزارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پر یہاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پیے بیٹھے　　دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لیے بیٹھے
گندی ہوئی گردن سے ہے گردنکشی اُنکی　　اور اُس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی اُنکی
نیکی یہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو　　اور دیکھ نہیں سکتے زمانہ میں کسی کو
افسوس کہ رتبہ میرا جانا نہ کسی نے　　اور میں نے جو سمجھا وہ مانا نہ کسی نے
لیکن جو زمانہ میں یہی کام ہیں ان کے　　خود دیکھینگے اک دن جو کچھ انجام ہیں انکے
ہرچند ہیں آج اہل زمانہ میرے دشمن　　اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن
پر بچتے وہ اِن کو جو ہیں سب برسر کیں ہیں　　جائینگے کہاں بچکے یہیں ہیں تو یہیں ہیں

یہ سن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا　　اور اتنے میں اک طرفہ تماشا نظر آیا
دو شخص سرِ معرکہ وہاں دفعتہً آئے　　اور شاہ کے پہلو میں بدرد و محن آئے
سر اپنے جھکائے ہوئے غمناک تھے دونو　　اور درد سے با دیدۂ غمناک تھے دونو
دونو کی وزارت تھی بہ دربار مروّت　　اور چلنا انہی دونو سے تھا کار مروت

ایک اُن میں کہ تھا برف سے ڈھالا بدن اُس کا　　تھا اُس کا بڑھاپا نمدی پیرہن اُس کا
وہ خلق خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا　　اور آنکھ سے دکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا
جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا　　اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گھلا جاتا تھا گویا
وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُس کا　　تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

ایک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اُس کے　　چہرہ پہ برستا حشم و جاہ تھا اُس کے

وہ نسخہ حیرت بہ نگاہ عقلا تھا / اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا

کچھ توڑے زر نقد کے تھے ہاتھ میں اُسکے / صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُسکے

پر ہاتھ میں توڑے جو پڑے از دام و درم تھے / خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے

عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا / اور بارِ وزارت وہ اٹھائے ہوئے سب تھا

دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے / سمجھا یہ مناسب دلِ آگاہ نے اُس کے

میرے عمل خیر کی یہاں قدر نہیں ہے / اور دور بخیلوں کا تہ چرخ بریں ہے

ہیں بسکہ بد اندیش پئے خلق خدا یہ / دینا تو جہنم میں گیا دوینگے کیا یہ

دل سینۂ گندم سے بھی ہے تنگتر ان کا / دینے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر ان کا

اب یہاں سے چلا شاہ خوش اقبال ہے اپنا / جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا

دونو وہ غرض باندھکے دستِ ادب آئے / اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیر لب آئے

بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے / یہ ملک فنا قابل آرام نہیں ہے

افسونِ فسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے / اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے

حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے / اب یہ رہیں گمراہ یہی ان کی سزا ہے

پر شاہ سے یہ عرض نمکخوار ہیں کرتے / از مصلحت وقت کو اظہار ہیں کرتے

گو اہلِ جہاں پھیرے ہیں رخ راہِ وفا سے / اور باندھے ہیں پیمانِ وفا مکر و دغا سے

پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں / اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں

سلطانِ مروت کو ہیں جو شاہ سمجھتے / اور شاہ کو ہیں سایہ اللہ سمجھتے

یہ وضع زمانہ کی خوش آئی نہیں اُن کو / ان قدموں سے منظور جدائی نہیں اُن کو

باقی نہیں دنیا کی ہوس کوئی رہی ہے / اب اُن کو تمنا جو رہی ہے تو یہی ہے

ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں / اور بندۂ حق وہ ہے جو ہے بندۂ احساں

جو جو کہ شرف پائے ہیں اس فیض کرم سے / شکر اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے

ایک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے | اور جوش جو ہیں جاں نہواخواہ کے اپنے
وہ رنگ میں شکریہ کے اِس آن نکالیں | اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارماں نکالیں

جب لب پہ یہ اُن کے سخن پُر اثر آئے | اس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے
گزرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں | اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں
کچھ بعد تامّل کے مگر اُن سے کہا یہ | اُن کی جو تمنا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ
گو روکنا میرا دلِ مجبور ہے مجھکو | پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھکو
دی جب کہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے | شہرت کی منادی سے وہیں سن لیا سب نے
پابند مروت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں | اور جلوہ نما جو ہمہ اخلاص تھے اُن میں
ہر سمت سے وہ فرقہ بفرقہ ادھر آئے | اور شاہ کے شکریے کو باچشم تر آئے

ایک فرقہ کا احوال نظر طرفہ تر آیا | وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا
دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آگے | اور دور سے تھی نور اڑاتی ہوئی آگے
شہرت کی دوامی نے کئے نام تھے روشن | آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن
امیدیں خلائق کی جو تھیں اُنکی طرف تھیں | اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُن کی طرف تھیں
تھے اہل جہاں گرد اُمنڈ آئے ہزاروں | اور دامنِ اُمید تھے پھیلائے ہزاروں
تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ | اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ
تھے نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے | ہاتھوں کے دئیے سب کے تھے آئے ہوئے آگے
پر شکل سے ملبوس سے اور طرزِ سخن سے | تھے مختلف الوضع جو وہ اصل و وطن سے
میں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا | اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا
وہ فرقہ مگر جب میرے نزدیک تر آیا | اور اُن میں مجھے حاتم طائی نظر آیا

سمجھا کہ سخاوت کے یہ پورے ہیں سماں کے
اور چشم مروت کے نظر کردہ ہیں سارے

بعد اُن کے جو اشخاص کہ آئے نظر آئے
وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے

تھے دولت و اجلال جلو میں لئے آتے
اور سر پہ ہما اُن کے تھے سایہ کئے آتے

تھے چترِ شہی ہوتے ہوئے قربان سروں پر
اور تاج فدا کرتے تھے جان سروں پر

پر دخل نہ واں تھا ذرا تاجِ زری کا
افسر تھا سرِ فرق وہ دارا ناموری کا

لہراتے ہے ایک ایک کے سر پر جو علم تھے
اعزازِ دوامی کے نشاں اُن پہ رقم تھے

تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے
تا حشر رہینگے سحر و شام چمکتے

تھے نور سے تمکین و وقار اُن پہ برستے
اور پھولوں سے تھے رنگِ بہار اُن پہ برستے

یکساں تھے بحیثیتِ اقبال وہ سارے
پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے

کچھ راز نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا
کہ صرف لقب اُن میں شہِ نوشیرواں تھا

میں سمجھا کہ ایسے جو یہ تسکیں ہیں آتے
اقلیمِ عدالت کے سلاطیں ہیں آتے

مثنوی موسومہ بہ گنج قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی
اور زیرِ نظر راہ تھی اسرارِ نہاں کی

ہر چند تھا جوں نقشِ قدم خاک کے اوپر
پر خاک پہ تھا میں نہ کہ افلاک کے اوپر

ہر دم مجھے گھر بیٹھے زمانہ کا سفر تھا
اور پاس تصور سے ہر اک دل میں گزر تھا

کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے
جو سینہ تھا گویا کہ ایک آئینہ تھا آگے

سینہ میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں
اور دل سے پہنچتا تھا کبھی نالہ کے تا لب میں

روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے
اور جوہرِ آئینہ خیالات تھے اُن کے

ہر منعم و ہر مفلس و ہر شاہ کو دیکھا
ہر مے کش و صوفیِ دل آگاہ کو دیکھا

ہر چند کہ رفتار یہ سیر سفری تھی
آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی

ہر دل میں نظر آتے تھے ارمان ہزاروں
اور ان میں خیالات پریشان ہزاروں

القصہ ہر ایک خانہ و کاشانہ میں ہو کر
یعنی کہ ہر ایک دل کے نہاں خانہ میں ہو کر

جب پائے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا
اک ایسے دل پاک میں پایا گزر اپنا

ہر چند کہ تھا تنگ وہ اوضاعِ جہاں سے
وسعت میں تھا کم دیدۂ کوتہ نظراں سے

پر گوشہ میں بیٹھا تھا لئے کون و مکاں کو
اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدانِ جہاں کو

دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا
اور جلوۂ انوار ہیں پرتو فگن اُس جا

ہر چند کہ دربار تو شاہانہ نہیں تھا
اُس دور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا

پر تھا عجب ایک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو
اور اُس کا دلوں پر وہ اثر تھا کہ نہ پوچھو

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا
اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا

واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا
جو رعب کے گھر سے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

اک مردِ مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا
اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا

عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک
آئے کہ نہ آسکے کوئی اُس بزم میں واں تک

تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُس کا
اور خلق میں تھا خواجہ قناعت لقب اُس کا

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی ‏— ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جدا تھی
اخلاق تھے یاران قدیمی میں ہمیشہ ‏— اور صبر و توکل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ ایک گوشہ میں سجادہ گزیں تھا ‏— پر مسند عزت کے لئے صدر نشیں تھا

تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایہ شوکت ‏— اور زیر قدم تخت نہ تھا پایۂ شوکت
پر کھتی تھی دولت کہ یہ ہمت کا دھنی ہے ‏— صورت بھی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپا سے عیاں شانِ قناعت ‏— اور پاؤں لپیٹے تھا بدامانِ قناعت

تھا بسکہ زمانہ سے سروکار نہ اُس کو ‏— دنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُس کو
نیت تھی نہ جاتی کبھی مضموں طلب تک ‏— اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک
تھی چشم تمنا نہ کسی چیز پر اُس کی ‏— آنکھوں سے اُبھرتی تھی نہ باہر نظر اُس کی

وہ شمع صفت گرچہ سر بزم تھا بیٹھا ‏— اور عزم ہدایت پہ بصد جزم تھا بیٹھا
پر دل جو پھرا تھا ہوس ملک فنا سے ‏— اور رُخ تھا بچائے ہوئے دنیا کی ہوا سے
نور اُس کا تو آفاق جہاں گھیرے ہوئے تھا ‏— جس رُخ سے مگر دیکھئے منہ پھیرے ہوئے تھا

جو لوگ وہاں اہل طریقت سے تھے آتے ‏— سب اہل یقین دل کی عقیدت سے تھے آتے
ملتی تھی جنہیں کچھ خبر اس رازِ نہاں سے ‏— ایک عینک اُنہیں ایسی عطا ہوتی تھی واں سے
جو دل کے لئے مایۂ روشن گہری تھی ‏— اور بہر نگہ سرمہ عالی نظری تھی

جوہر یہ کرامات کے تھے اس کے اثر میں ‏— کر دیتی تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں

یا دور کے مقصد کو تھی نزدیک لے آتی | اور سامنے اس طرح سے تھی ٹھیک لے آتی
موجود کبھی ہوتے تھے مقصود نظر میں | یکساں تھے کبھی بود یہ نابود نظر میں

تھا جلوۂ رُخ سامنے اُس مرد خدا کا | جو دفعتہً ایک آگیا جھوکا سا ہوا کا
قدرت کا تماشا وہ دکھاتا ہوا آیا | ایک پرچۂ اخبار اُڑاتا ہوا آیا
قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے | رکھا بہ ادب سامنے اُس مرد خدا کے

وہ نامہ دیا پیکِ صبا نے جو ہمیں لا کر | دیکھا اسے تب خواجہ قناعت نے اُٹھا کر
طوفان طمع میں جو پڑی خلق خدا تھی | اور چلتی زمانہ میں ہوس کی جو ہوا تھی
لکھے اُس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر | اور لکھے رقم ایک ایک کے اعمال سراسر

اُس نامہ پہ جب خواجہ قناعت نے نظر کی | اور دیکھی یہ روداد بنی نوع بشر کی
آزردہ ہوا درد محبت کے سبب سے | منہ پھیر اسو ئے ستِ چپ ایکبار غضب سے
اس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا | یا شیر کہ ہو درد سے بے صبر گرجتا
معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں اُس کو | بھیجا ملک القدس کے دربار میں اُس کو
پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے | اس واسطے ایک آپ بھی عرضی لکھی اُس نے
تحریر کئے اُس میں جو تھے حال یہاں کے | اور جن میں تھے آلودہ بد اعمال یہاں کے
لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا | ایمان ٹھکانے نہیں دنیا میں کسی کا
دیتے مری نیکی کا بدی ہیں صلہ مجھ کو | اور کہتے ہیں بے ہمت و بے حوصلہ مجھ کو
ہے ان کو ہوس طوق بگردن کئے پھرتی | کتّے کی طرح سب کو ہے در در لئے پھرتی
آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا | پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا

ہیں خواری و زاری کے لیئے سارے خواص اُس کے
اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اُس سے

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے
دن رات پڑے ہیں الم و یاس سے مرتے
محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی اُن کی
اور حد سے سوا گزری ہوئی ہے تہی دستی
ہیں خانۂ ہستی میں وہ مکڑی کا نمونہ
تن ہو گئے ہیں سوکھ کے لکڑی کا نمونہ
تنتے ہیں خیالوں کے سدا تار گھروں میں
دن رات پڑے بنتے ہیں بیکار گھروں میں
جب دیکھو اپاہج کی طرح خوار ہیں گویا
جیتے ہوئے ایسے ہیں کہ مردار ہیں گویا

اور ایسے بھی کچھ ننگِ خلائق ہیں جہاں میں
جو تن کو لئے بیٹھے ہیں رحمت کی اماں میں
پر دل میں سدا کام سے ہیں جان چراتے
اور جان کے پردہ میں ہیں ایمان چراتے
ہیں رنگ فقیری کا جمائے ہوئے بیٹھے
اور دام دغا اُس میں لگائے ہوئے بیٹھے
وہ تارکِ دنیا نہیں عقبےٰ کی غرض سے
دنیا کو ہیں چھوڑے ہوئے دنیا کی غرض سے
ظاہر میں فقط زہد کی تصویر ہیں گویا
دل دیکھو تو شیطان کے بھی پیر ہیں گویا
ہے چاٹ زباں کو جو لگی مفت خوری کی
پروا ہے اب ان کو نہ بھلی کی نہ بُری کی
جو کچھ ہو نہ کرنا یہ بدانجام ہیں کرتے
اور نام ہنر مفت میں بدنام ہیں کرتے

حالاتِ جہاں سارے کہے جب قلم اُس نے
تب کی یہ رقم مہر زبانِ قلم اُس نے
یعنی یہاں رہنا مجھے منظور نہیں ہے
اور آپ کا دربار بھی کچھ دور نہیں ہے
بلوائیں تو بندہ ابھی یک آن میں آئے
یہاں آؤں تو پھر جان میری جان میں آئے
یہ حال میں اپنے ہوں گرفتار ہمیشہ
خواری میں جو خوش ہیں تو رہیں خوار ہمیشہ

دیکھا ملک القدس نے حال اہل جہاں کا | اور حال کھلا اُن کے ہر ایک ازِ نہاں کا
فرمایا اسی وقت کہ دربار ہو قائم | اور اُس میں ایک آئینۂ اسرار ہو قائم
مخلوق کہ ہیں خاص سے تا عام جہاں میں | جاری ہوں اسی دم اُنہیں احکام جہاں میں
تا جملہ زن و مرد سے لے پیر و جواں تک | ہیں ہو چکے آفاق میں اور ہونگے جہاں تک
وہ آکے حقیقت سرِ دربار دکھائیں | اور یہاں انہیں آئینۂ اسرار دکھائیں
تا جوہرِ اصلی جو ہر ایک دل میں نہاں ہوں | آئینہ میں وہ صورتِ آئینہ عیاں ہوں

جس دم یہ دیا حکم جہاندار جہاں نے | مشہور کیا خلق میں شہرت کی زباں نے
یہاں سنتے ہی کل خاص سے تا عام تھے جتنے | ارواح سے تا عالم اجسام تھے جتنے
جو جو کہ تھی مخلوق خدا نیک سے بد تک | اور ہو چکے یا ہونگے ازل تا بہ ابد تک
تحفے لئے ہاتھوں میں دل و جان کے حاضر | دربارِ مقدس میں ہوئے آن کے حاضر

بیٹھا ملک القدس باورنگ عدالت | چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگِ عدالت
آئینہ کہ جوں شیشۂ افلاک تھا روشن | یا اہل صفا کا وہ دلِ پاک تھا روشن
پرتو فگن اُس میں تھے جو انوار حقیقت | کھلتے تھے پڑے خلق کے اسرار حقیقت

دربار میں یکبار منادی نے ندا دی | اور گوشِ عقیدت میں وہیں سب کو سنا دی
یعنی کہ بترتیب ہر ایک فرقہ جدا ہو | اور سامنے آئینہ کے حاضر بصفا ہو
دنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی | اور دیتا خبر ہے نہ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اس میں اُتر آئے | باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے

ایک فرقہ نیک ہوا دربار میں حاضر
اور پہلے ہوا معرض اظہار میں حاضر

خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی انمیں
تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی ان میں

پر چتر لگائے تھا وقار ان کے سروں پر
دولت کھڑی ہوتی تھی نثار ان کے سروں پر

بھوکے بھی جو تھے ان میں تو جی سیر تھے انکے
آسودہ شکمی نے کئے دل سیر تھے ان کے

خالی تھی سب سے نہ آسودہ شکمی بھی
ایک بات میں تھی ان کو قناعت کی کمی بھی

یعنی کہ بظاہر تھے شکم وصل کہیں
جس سے کہ سبک تھے کسی ناکس کی نظر میں

بھوکے تھے فضل و کمالات کے سارے
محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے

دیکھے ملک القدس نے جب حال بھلوں کے
آئینہ ہوئے جوہر اعمال بھلوں کے

اعزاز دوامی کے دئیے تاج بھی ان کو
اور ملک قناعت کے دئیے باج بھی انکو

تا اہل جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ
اور رہویں زمانہ میں با عزت ہمیشہ

بعد اس کے گروہ اور ایک آتا نظر آیا
اور اس میں تماشا یہ نظر طرفہ تر آیا

آئے بھوس سب سے قدم مار کے آگے
پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے

سر تا بقدم عکس ہوئے جلوہ گر اس میں
اس طرح کہ آئے وہ نظر جانور اس میں

جن کے بدنوں پہ نہ دہن تھے نہ گلے تھے
کھانے کے لئے سارے شکم ہو کے کھلے تھے

ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر
مانند مگس تھے کبھی اس پر کبھی اس پر

تھے خوار ہی و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے
اور ہونٹ تھے مکھی کی طرح چاٹتے پھرتے

پر ولولۂ حرص نہ ہوتے تھے کم ان کے
غربال کی صورت تھے نہ بھرتے شکم انکے

کچھ لوگ عجب رنگ دکھاتے ہوئے آئے
اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے

راحت طلبی اُن کو گرانبار تھی کرتی
اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہل کر اُنہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا
یا قیدِ مشقت کی طرف جبر کا جانا آتا
آنے میں بھی تھے جان چرائے ہوئے آتے
لوگ اُن کو تھے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے آتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے
اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے
تھے منہ بہ کہ سر ڈالکے ناچار کھڑے تھے
اور کرتے تجاہل سرِ دربار کھڑے تھے

اوٹ حق کی اوجھل میں جو عیار تھے بیٹھے
دن رات شکاروں کے طلبگار تھے بیٹھے
پردہ میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے
اور دامِ دغا تھے پئے نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت و شان سے آئے
لیکن نظر آئینہ میں شیطان سے آئے
روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے
گرگٹ کے مگر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے
اور آئینہ حالات و خیالات جہاں تھے
اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو
حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

بند آنکھیں کئے کیوں پھرے ایک ایک کے گھر تو
اپنے ہی چپ و راست ذرا غور تو کر تو

پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو
آزاد وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

مثنوی مسمّیٰ بہ ابر کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتب انقلاب کے
دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے

دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا
جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا

شاہان ماسلف کے مرقع عجیب ہیں
روشن سب اُس میں عہد بعید و قریب ہیں

تحریر تازہ لاتی ہے نقدیر سامنے
آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے

اس کشور فنا کا عجب طرز و طور ہے
دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے

قانون انقلاب یہاں رسم و راہ ہے
موسم بموسم اس میں نیا بادشاہ ہے

اب یہاں جو چند روز سے قانون عام ہے
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا
ایک حکم تھا جو گرم تو ایک حکم تیز تھا

منہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی
اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی

دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی
پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی

شہروں میں سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

طفل نبات پیاس کے مارے بلک گئے
خلق خدا کے نالے بہت دور تک گئے

سیماب ہو کے سینہ سے ہر دل نکل چلا
اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا

دل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے
انسان تڑپ کے ماہئ بے آب ہو گئے

پر اب ہے دور دورۂ برشکال کا
چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا

گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا
اور رنگ آسمان و زمین کا بدل گیا

فرمان راحت سحر و شام آ گیا
خلق خدا کی جان کو آرام آ گیا

اے ابر آکہ تو توشہ برشگال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگ جہاں ہے اور
نور وز آب ورنگ بہارِ جہاں ہے

جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیری زمیں ہے اور ترا آسماں ہے اور
تو نو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

اے ابر جوش سبزہ و گلبن نہیں ہے یہ
مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو
آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے
تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے

پھولوں نہیں سماتی خوشی سے نہیں ہے یہ
آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو
دیوار و در سے آج برستا سرور ہے
سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آب حیات کا
تو دودھ ہے نباتات کے اطفال کے لیے
اے ابر زور کیا کہوں ہیں تیرے شیر کے

پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا
اور زندگی درخت کہن سال کے لئے
دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے

سب تجھ سے نونہال چمن سبز بخت ہیں
یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے

اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں
ہیں حوصلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پرنیاں سبز اڑھاتا زمیں کو ہے
گردوں پہ کرتا عالم نیرنگ ہے کبھی
سیماب صبح میں کبھی شنگرف گھولتا
لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے
یوں رنگ مبدم جو بدلتا جہاں کے ہے

پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے
دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی
اور وہ نگار خانۂ چینی کا کھولتا
کرتا فلک کو بادلوں سے گلپوش ہے
اے ابر سیکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ فوج کے ‏— دَل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے تُو بزّاد کی صورت بنا کے تو ‏— اور بال و پر سمٹ کے ہے اُڑتا لگا کے تو
اُس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب ‏— اے ابر تیرے ساتھ یہ گھمسان ہے غضب
ہل جاتے ہیں تری گرج کہ دل زار ہل گئے ‏— ہیبت سے تیرے رعد و برق کی کہسار ہل گئے
لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں ‏— اور ٹہنیوں کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہی
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا ‏— اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں ‏— یہ لطف عیش لطف ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے لب بھی پیاس کے مارے کھلے ہوئے ‏— گلشن کے نونہالوں کے منہ تھے سوکھے ہوئے
انسان پھر رہے تھے پیاس سے بدحواس ‏— منہ کھولے تھے کبوتر و گنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے منہ پہ ترے آنے سے آگئی ‏— آنے سے تیرے جہان میں ہے جان آگئی

تیرا خطاب رحمت پروردگار ہے ‏— خلق خدا کے رزق کا تو ذمہ وار ہے
سرمایہ تو ہی دیتا ہے تجار کے لئے ‏— اور سایۂ ہما ہے زمیندار کے لئے

اے ابر وہ جو خلق میں دہقان پیر ہیں ‏— عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں
اُن کو امید تھی۔ نہ کسی کی پناہ تھی ‏— تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں ‏— ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

اے ابر تیرے فیض کا ہر جا ظہور ہے ‏— پر کوہ و کوہسار میں کچھ اور نور ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے ‏— اور نگینوں سے لیکے شجر تک ہرے کھڑے

چشمے ہیں جا بجا تری رحمت کے بہ رہے ۔ گویا زبانِ موج سے ہیں شکر کر رہے

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا ۔ ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا
اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی ۔ دیکھو ہیں آیا توڑ کے زنجیر موج کی
دیوانہ وار کف بہ لبِ آب مارتا ۔ گاہے تھپیڑے ہے گہے گرداب مارتا
یہ جوش یہ خروش سماں ہے دکھا رہا ۔ ہر موج میں ہے نوح کا طوفاں اٹھا رہا

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر ۔ جس کی کہ کشتی نہیں موقوف جام پر
مستانہ پن میں گھٹتا ہے دیوانہ طور کبھی ۔ مستانے ساتھ بیٹھا ہے چہچہاتا ہے کبھی
سبزہ پہ لوٹتا ہے فراغ آسماں پہ ہے ۔ اور دمبدم بہ طیش تو دوں نہال پہ ہے
یوں پھوٹ کر چلے ہیں گل و ریحاں نکل پڑے ۔ کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

اس وقت جو چھایا ہوا ہے جہان پر ۔ چھایا ہوا سماں ہے زمین آسمان پر
چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر ۔ اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی ۔ سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی ۔ اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومتا وہ جوانانِ باغ کا ۔ جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز ۔ سیراب باغ و دشت تو گلہا سبز سبز
ان سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے ۔ طوطی برنگ طائر بسمل ہیں لوٹتے
شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی ۔ موتی بکھیرتی ہے جو اکسر لٹا رہی
سبزہ کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے ۔ شاخ و شجر تمام مرصع کھڑے ہوئے

پتوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں ‌ ‌ ‌ ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
شبنم کا جوش اگر یہی طوفاں اٹھائیگا ‌ ‌ ‌ ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائیگا
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آگئے ‌ ‌ ‌ اور شامیانہ شرق سے تا غرب چھا گئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے ‌ ‌ ‌ برسیگا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
آیا امنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندوکار ہے ‌ ‌ ‌ نو دن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار ہے
لیکن یہ یا جرا سا برستا پھوار کا ‌ ‌ ‌ ہیگا پیام ابر بہاری کے تار کا

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں ‌ ‌ ‌ اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے ‌ ‌ ‌ وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا ‌ ‌ ‌ اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا
گرتا وہ آبشار کی چادر کا زور سے ‌ ‌ ‌ اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت بھی تالاب آب کے ‌ ‌ ‌ گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
ہر جا پہ طائران چمن غول غول ہیں ‌ ‌ ‌ آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں
کوئل کا دور دور درختوں میں بولنا ‌ ‌ ‌ اور دل میں اہل درد کے نشتر گھنگولنا
طاؤس کا وہ دُم کو چھتور کر کے ناچنا ‌ ‌ ‌ اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے ‌ ‌ ‌ ایک قہقہہ بہ طنز لگاتا چکور ہے
املی کے ایک درخت میں جھولا پڑا ہوا ‌ ‌ ‌ اور ساتھ اس کے آم کا پٹڑکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے ‌ ‌ ‌ اور نیچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا ہے طوفاں لبوں میں ہے ‌ ‌ ‌ پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے ‌ ‌ ‌ بادل گرجتے پردے میں دیتا ٹھکور ہے

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں
لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں

کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا
ہر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا

سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا
چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا

بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقابِ ابر میں چشمک ہے ناز سے

اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے
نالہ کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے

کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں
ہے گل کو فخر آوے اگر پائے بوس میں

آنا وہ بھینی بھینی ہوا کا کبھی کبھی
بول اٹھنا مرغ نغمہ سرا کا کبھی کبھی

آرام کر رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو
قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو

آزاد لکھتے لکھتے ہے آدھی تو ڈھل گئی
اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

طول امل کو اپنے اب انجام دیجئے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجئے

مثنوی زمستاں

اے زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفانی
شاہ برفانی و شاہنشہ برفستانی

تخت اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا
اور ہے دربار سرِ کوہِ ہمالا تیرا

مشرق تا غرب ترا ملک ہے ہر طرف سفید
اڑ رہا پرچم اقبال ہے جوں برف سفید

جب کہ عالم پہ ہے تو لشکر جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے الٹتا آتا

بادِ صرصر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی
فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی

طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیر جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھوکا جاتا
مارے ہیبت کے ہے دل سینو نمیں تھرّا جاتا

ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے
پُرزے پُرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھوکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوندِ زمین ہو جاتا

تیرے سنّاٹے سے ہوتی ہے ہوا جانِ نبات
خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلانِ نبات

تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانانِ چمن
منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحانِ چمن

ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اُڑاتے سارے
گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے

نغمہ سنجانِ چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے
اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے

باغباں کا جو گلستاں میں گزر ہوتا ہے
لبِ حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے

یاالٰہی وہ جوانانِ چمن ہو گئے کیا
باغ سنسان ہے مرغانِ چمن ہو گئے کیا

رازِ غم کس سے کھلے باغ میں بلبل بھی نہیں
کان میں پوچھئے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے
نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

کہ درختانِ چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں
ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں

اے نسیما جو ہوئی خامہ سے ہے بوالعجبی
فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی
دفعِ زہرِ حشراتی کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفعِ وباؤں کی بلا ہوتی ہے
اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے
پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تا قاف کیا
شیشۂ گنبدِ فیروزہ ہے شفاف کیا

مخمل و قاقم و سنجاب پنہاتا تو ہے
بہت اثمارِ تر و خشک کھلاتا تو ہے

تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا
تھا نہ کھانے ہی کا کچھ اور نہ پینے کا مزا

اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں
گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا — اور بغل سے دلِ وحشت زدہ نکلا جاتا
یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے — آگ ہاتھ آئے تو ہیں دل میں چھپائے لیتے
مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں — بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا — پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے — کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے — لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے
کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں — ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں
کہیں سو سو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے — گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے
حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے — رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے قالی کے
اس کی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے — پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے
خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی — تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی
ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں — دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

تیرے فیضانِ سخاوت تہِ افلاک ہیں عام — ملتی سب اہلِ جہاں کیلئے پوشاک ہے عام
اہلِ دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے — غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے
کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر ایک حال میں مست — ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست
جانِ عالم ہیں الگ بستر مخمل میں پڑے — فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

اے نئے مستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف — تیری شبہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف
کی تری رات نے دانائوں کی ہے بات بڑی — کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی
ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا — اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا

بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے | ساز عشرت کے لئے برگ نوا ہے تجھ سے
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا | پان کھانے کا گلوری کے چبانے کا مزا
یار حقے کے ترے دور میں لیتے ہیں مزے | دود تلخ اُس کے سوا دود سے پیتے ہیں مزے
گھونٹ حقے کا یہ ہر دم نہیں ہم پیتے ہیں | اے مستاں ترے عشق کے دم بھرتے ہیں
صوفی و رند کے جلسہ کا تو ہی ساقی ہے | مایہ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے
ہر طرف ہلکی پیالی پہ پیالی اُڑتی | مے نہ ہووے تو ہے تصویر خیالی اُڑتی
پی کے نشے مست چپکے شکر خدا کرتے ہیں | چائیں پی پی کے ترے حق کو دعا کرتے ہیں

شب سرما میں اگر لطف ہے بیہوشی کا | تو اسی شب ہے مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے | بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایوان میں ہیں وہ کے عدالت کرتے | ہیں کتابوں کے وکیل ان کی وکالت کرتے

جلوہ گر پیش نظر ہوتی ہے فانوس خیال | پھرتے ہیں چار طرف دوڑتے جاسوس خیال
بیٹھا جمشید کہیں دیکھتا ہے جام اپنا | پر سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ انجام اپنا
دوش ضحاک پہ آتے ہیں کبھی مار نظر | سر ضحاک ہے آتا ہے سر دار نظر
گرز کو دوش پہ رستم ہے اٹھائے جاتا | ہفتخواں میں ہے کبھی رخش اُڑائے جاتا
کبھی سہراب سر خاک نظر آتا ہے | باپ بھی غم سے جگر چاک نظر آتا ہے
کہیں دربار سکندر کہیں بزم دارا | اور کہیں بزم سکندر ہے یہ رزم دارا
تن دارا ہے کبھی بے سر و افسر ہوتا | اور سر لائے ہے کٹا اُس کے سکندر روتا
خضر کے ساتھ سکندر کبھی ظلمات میں ہے | کبھی نوشابہ سے مصروف ملاقات میں ہے
زند پازند کو زرتشت سناتا ہے کبھی | شعلہ و آب میں آتش کو دکھاتا ہے کبھی

کبھی محمود ہے چڑھکر سر جےپال آتا
کشور ہند میں گویا کہ ہے بھونچال آتا

نقشۂ نعمان خورنق کا جماتا ہے کبھی
سنجار اپنے کٹے ہاتھ دکھاتا ہے کبھی

گاہ چنگیز ہے اور گاہ ہلاکو آتا
جیسے گھر لوٹتا ہووے کوئی ڈاکو آتا

جب بہت طول پکڑتی ہے شب دیجوری
لیکے تیمور ہے آتا تزک تیموری

ہند سے گرچہ بہت جلد چلا جاتا ہے
پشت در پشت نگر سکہ جماتا ہے

بزم افسانہ میں وہاں خسرو پرویز کبھی ہے
باربد زمزمہ سے اپنے شکر ریز بھی ہے

قصر شیریں سے ہے فرہاد بھی دلگیر آتا
پر بغل میں لئے شیریں کی ہے تصویر آتا

خون فرہاد سے تیشہ ہے کھلاتا لالہ
چادر اوڑھے ہے کھڑی پیرزن آلا نہ

ہیں یہاں انجمن علم کے جو صاحب راز
فصل سرما میں ہیں جب دیکھتے شبہائے دراز

خانۂ دل میں وہ اک بزم ہیں قائم کرتے
منعقد مجلس ارباب عمائم کرتے

فخر رازی کبھی لے آتے ہیں تفسیر کبیر
بو علی آکے سناتے ہیں شفا کی تقریر

ہوتی ہیئت کی مجسطی سے ہے توضیح اول
کبھی ہوتی ہے سطرلاب کی تسطیح وہاں

ہے کوئی جلد دلائل کو مجرد کرتا
کوئی ابطال جسر لا یتجزیٰ کرتا

ہے دلائل سے خلا کو کوئی باطل کرتا
پر ہے دانائے فرنگ اسکو بھی قائل کرتا

دفعتہً چلتی ہے مجلس پہ ہوائے یونان
یعنی تشریف ہیں لاتے حکمائے یونان

ہے فلاطوں لئے اشراق کے آئینہ کو
کرتا آئینہ سے ہے صاف سوا سینہ کو

پر ارسطو جو کبھی بزم میں آجاتا ہے
باتوں ہی باتوں میں ہر مشکل مٹا جاتا ہے

رکھتے ہیں جو کہ طبیعت میں ہوائے گیتی
چلتی ہے اُن کے دلوں پہ جیسے چھری

آکے سودا کبھی اک ہجو سنا دیتے ہیں
لیکن اس طرح کہ بلبل کو رلا دیتے ہیں

پھر کبھی بڑھ کے سناتے ہیں قصیدہ اپنا
ناسخ و آتش و انشا و نصیر آتے ہیں
میر پڑھتے ہیں کوئی شعر گزیدہ اپنا
غالب و ذوق مگر خاتمہ کر جاتے ہیں

ہوتی اتنے میں ہے افلاک پہ تنویر سحر
سر پہ وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہے موے سفید
شجرِ طور کا عالم ہے بنا آتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے
ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیر سحر
ریش پر نور میں ہے جلوہ نما روے سفید
ساتھ ہے کوہ ہمالا کو اٹھاتا لاتا
ملک تاتار کی تصویر دکھا دیتا ہے

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور
ایک جھونکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک
وہاں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے
ہر شجر پہ ہے غرض رنگ بدل کر آتا
اے زمستاں ترے اس ملک میں آئین ہیں اور
تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
زعفران پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
آبِ زر روے نباتات پہ پھیرا کس نے
پتے پتے کو جلاتا ہوا ایک لخت آتا
جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
کہیں زرکار ہے آتا کہیں مسکرا آتا

پھر ترے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے
برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سر خاک پڑے
دفعتاً پیر سحر سانس ہے بھرتا ایسا
کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یکبار سفید
کہ نباتات پہ طوفان بلا ریزی ہے
اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے
یا زمانہ پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید

اسکی طرح بخارات کا گھر کر آنا
برف کے پردہ میں وہ روئی دھنکتے جانا
ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اُڑتے
اور ہوا میں ہیں کبھی روئے کے گالے اُڑتے
جابجا آب رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
اور سر چشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے
جو شجر گلشن ہستی میں برہنہ تھے کھڑے
یا کہ پتوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے
شجر نور سر طور نظر آتے ہیں
سر بسر غیرت بلّور نظر آتے ہیں

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانہ سے الگ
یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ
جام گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر
اور ہوا میں ہے تباشیر اڑاتا کیونکر
ابر و باراں تو تہ چرخ بریں دیکھا تھا
پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

جبکہ ہوتا ہے گزر جانب کہسار ترا
فن صنعت ہے وہاں اور کچھ لے یار ترا
بت تراشی میں ہے تو غیرت فرہاد وہاں
قصر شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں
ایک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا
صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا
پتے پتے کا ہے تصویر میں انداز درست
اور ہر ایک میوہ ہے قدرت سے خدا ساز درست
اژدہا دامن کہسار میں سوتا ہے وہیں
برف کا اسپ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں
ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی
اور پری ہے پر پرواز سے تیار کھڑی
چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کرجاتا ہوں
اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں
برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا
اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا
شیر وابستہ زنجیر بناتا ہے وہیں
اور کبھی فیل کی تصویر بناتا ہے وہیں
کبھی انسان کبھی حیوان بنا دیتا ہے
اور کبھی صورت شیطان بنا دیتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو
تو کبھی رشک دہ مانی و بہزاد ہے تو
برف سے جب کہ نکھرتا فلک زنگاری
اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری
کسی صیاد کو ہے کرکے ضیافت لاتا
اور کوئی صید ہے سرگشتہ آفت لاتا
لیتا پھر کار قلم ہے دم شمشیر سے تو
اور ہے شنگرف کو لیتا رگ نخچیر سے تو
کی سر خاک جو کھنی برف نے سیمیں کاری
خون بے جرم سے کرتا ہے اسے گلناری
صید نومید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے
تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گزر جب کہ ترا جانب دریا ہوتا
ایک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا
ایسا تو حکمت جادو سے جماتا ہے اسے
سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اسے
کارواں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں
جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہوں ڈاریں جاتیں
پل میں بے کشتی و بے پل پار اتر جاتے ہیں
سفری سینکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں
روئے دریا پہ گزر مثل خضر ہوتا ہے
ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشن انس و فرہنگ ہے ملک فرنگ
اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
یار دستانے کہیں بگھی میں اڑاتے جاتے
جلوۂ تخت ہوادار دکھاتے جاتے
نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست
پہلواں بے مے و بے جام شرابوں سے ہیں مست
ہے زبس جوش دلی حوصلہ انگیزی میں
سب کمر بستہ ہیں میدان سبک خیزی میں
پاؤں میں کاٹھ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے
اور عصا اپنے سر برف جمائے ہیں کھڑے
قدم آگے کو رپٹکر ہیں نکلتے جاتے
یہ اچھل جاتے ہیں اور آگے پھسلتے جاتے
کوئی گھڑ دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا
پر رپٹ دوڑ کا میدان نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی — مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ ورق ہاتھ میں تھرّاتا ہے — اور قلم ہاتھ سے تھرّا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکائے لیتا — منہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
مرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا — ترے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں — اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں

طپش عشق سے دل رہوے مرا نرم سدا
گرمی شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

مثنوی مصدرِ تہذیب

زمیں پہ مہر کی جس دن کی تھی نظر پہلی — اور آفرینش عالم کی تھی سحر پہلی
مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا — اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی — اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی
افق میں تھا کوئی کافور اُڑا رہا گویا — زمیں سے تا بفلک نور اُڑا رہا گویا
کنار کوہ پہ سورج تھا دیتا دکھلائی — کہ جیسے گیند طلائی ہوا میں لٹکائی
دکھا کے گوشۂ ابرو ذرا چمک جانا — لحاف ابر میں منہ دیکے پھر دبک جانا
کبھی پہاڑ پہ سر بھی ابھار لیتا تھا — شفق کے خون میں پھر غوطہ مار لیتا تھا
وہ دن جہان میں تھا نوروزِ روزگار کا دن — جدھر کو دیکھئے گویا کہ تھا بہار کا دن
ہوا میں فیضِ مسیحا کی شان تھی گویا — کہ آئی قالبِ بیجاں میں جان تھی گویا
پڑے چھلکتے گلوں کے ایاغ تھے سارے — کھڑے لہکتے جوانانِ باغ تھے سارے

سحر کا فیض جو ہر خشک و تر پہ طاری تھا — تو آب بحر بھی کس مزے سے جاری تھا
دلوں کو موج کے دریا میں اضطراب نہ تھا — ہوا کے صدمے سے کھٹکا خطر حباب نہ تھا
نہ خوف لطمۂ و گرداب غوطہ بازوں کو — نہ فکر بادِ مخالف کا تھا جہازوں کو
جو اپنی حد سے ہوا کچھ زیادہ ہوتی تھی — تو ناخداؤں کو بادِ مراد ہوتی تھی

زمین سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی — صبا جو اُس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
تمام دشت چمن در چمن پڑے ہوئے تھے — پہاڑ پھولوں سے من بھرے کھڑے ہوئے تھے

شعاع مہر کا تھا ہر جگہ پہ کام جدا — ہر ایک کام میں کرتی تھی اہتمام جدا
ہوا میں سیپ کے مقیش تھی اڑا دیتی — زمیں پہ چادرِ مہتاب تھی بچھا دیتی
جگر میں شاخ کے پانی کو خوں بناتی تھی — اور اُس کے خون کو گلِ لالہ گوں بناتی تھی

نگاہ ایک سی تھی سوئے خشک و تر اُس کی — گزر رہی تھی دل سنگ میں نظر اُسکی
کبھی جو تھی نگہ لطف سرسری کرتی — تو دل میں کوہ کے تھی کیمیا گری کرتی
کہیں جو سنگ کو گرمی سے تاب دیتی تھی — تو اُس کو لعل و زمرد کی آب دیتی تھی

غرض کہ خلق میں دریا تھا فیض کا جاری — اور اُن میں کارِ خدائی تھے جا بجا جاری
اُٹھی دمامۂ دولت سے دفعتہً یہ صدا — اُڑی جہاں میں تہِ گنبدِ کہن یہ صدا
اُٹھو کہ صبح سعادت کی نوبت آئی ہے — نظر کرو کہ عیاں شانِ کبریائی ہے

صدا کے ساتھ اُڑے سب کے خواب آنکھوں سے — دلوں سے اُٹھ گئے پردے حجاب آنکھوں سے

نظر اُٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے شان خدا
جلوس ہے ملک القدس کا بروے سریر
زبسکہ ذات مقدس ہے اس کی ذات کمال
صفات ذات ارکین دولت اُس کے تھے

کھلا ہے فیض کا در بہر بندگان خدا
نگاہ ذرہ و خورشید ہے بسوے سریر
کھڑے ہیں ست ادب باندھے رتبۂ صفات کمال
بناے دولت و سامان صولت اُسکے تھے

زبسکہ فیض سحر تھے دلوں پہ چھائے ہوئے
تھی اعتدال پہ جو وہاں کی بات ہوتی تھی
شعاع مہر زیادہ چمک نہ سکتی تھی
کرن ہو تیز تو تھی دھوپ وہاں سے ٹل جاتی

ظہور قدرت حق آنکھوں میں سمائے ہوئے
نہ دھوپ تیز نہ تاریک رات ہوتی تھی
اور اُس کی نوک نگہ میں کھٹک نہ سکتی تھی
بہت جو ہوتی اندھیری تو رات ڈھل جاتی

رواج عیب کا جلتا وہاں چراغ نتھا
نھا رات دن کا برابر تلا حساب وہاں
ہوا کے وہاں چلن آکر درست ہوتے تھے
کبھی نسیم تھی آتی کبھی صبا آتی
کہ آب و رنگ جہاں رونق بہار سے ہو

دھوئاں ہی کا پہنچا پئے دماغ نتھا
ہمیشہ رہتا تھا میزاں میں آفتاب وہاں
جو صرصر آئے تو زور اُسکے سست ہوتے تھے
اور اس روش سے پھولونکو تھی سجا جاتی
پہ گل کے پہلو کو صدمہ نہ نوک خار سے ہو

جو مالطبع تھے وہاں آکے سیدھے چلتے تھے
زیادہ و کم کو وہاں اعتدال تھے گویا
جو بدمزاج تھے وہاں خوش مزاج ہوتے تھے

اور اُن کے تکلے کی مانند بل نکلتے تھے
جو بد تھے نیک با صلاح حال تھے گویا
سبھوں کی کج روشی کے علاج ہوتے تھے

وہ شاہ لطف سے تھا کر رہا جہاں پہ نظر

کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر

خدا کے بندوں پہ اُلفت زبس تھی عام اُسکی
فروغِ عام تھی مثلِ مہ تمام اُس کی

وہ جوشِ الفت دل کام کر گئے پردہ میں
یکایک آنکھوں سے نکلا نظر کے پردہ میں

تھا حسنِ خلق جو پھیلا رہا شمیم اُس کی
اسی پہ خاص ہوئی الفت عمیم اُس کی

دیا یہ حکم کہ تم سوئے خلق جاؤ ذرا
ہمارے لطف کا جلوہ اُنہیں دکھاؤ ذرا

دلوں کی مملکتوں کا خراج اُس کو دیا
بہار گلشن جنت نے تاج اُس کو دیا

ہر ایک پھول کو سو رنگ و بو سے چمکا کر
اور اُس پہ شبنمِ آب حیات برسا کر

کیا بجانبِ ملکِ نثار روانہ اُسے
کہ ہو قیام قیامت تلک فنا نہ اُسے

غرض کہ خسروِ اخلاق خلق میں آیا
شمیمِ خلق سے باغِ جہاں کو مہکایا

بہ حسنِ خلق سے تسخیر کر لیا سب کو
کہ جیسے رشتۂ زنجیر کر لیا سب کو

بہارِ خلق سے اُس کے ہوا چمن عالم
اور اُس کے نور سے انجم کی انجمن عالم

شگفتہ روئی پہ صدقے بہار ہوتی تھی
دہن پہ خندہ جبینی نثار ہوتی تھی

وہ منہ سے بات جو کرتا تو پھول جھڑتے تھے
جو چپ رہے تو چمن آ کے پاؤں پڑتے تھے

کیا نہ دل میں بد و نیک کا خیال اُس نے
ہر ایک کو کر دیا خوشحال حسبِ حال اُس نے

جہاں میں بحرِ کرم اُس کی ذات تھی گویا
وہ ذات چشمۂ آب حیات تھی گویا

رہا زبسکہ نہ محروم اُس ابرِ تر سے کوئی
پھرا نہ خلق میں ناکام اُسکے در سے کوئی

تو مدح خوان ہوئے سب اہلِ روزگار اُس کے
دئے زمانہ میں شہرت نے اشتہار اُس کے

اُمنڈ کے لوگ یہ نزدیک و دور سے آئے
کہ جیسے مور و ملخ ہوں وفور سے آئے

وہ اُس کے بندۂ بے دام ہو گئے سارے
غلام خاص سے تا عام ہو گئے سارے

درِ اُمید کھلا تھا ہمیشہ سب کے لئے
نہ حکم خاص تھا دن کا نہ قید شب کے لئے

اگرچہ بہر بد و نیک تھا کھلا دربار — دل سخی کی طرح تھا ہمیشہ وا دربار
زیادہ سب سے قباحت یہ روبکار آئی — کہ بزم جشن میں خلقت جو ایک بار آئی
تو خاص و عام یہاں آکے باریاب ہوئے — سبھوں کو وہاں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے
اُنھی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے — ظرافتوں نے بہت باغ سبز دکھلائے
لطائف اُن کے یہ دربار کو پسند ہوئے — کہ شہ کی خدمت عالی میں سربلند ہوئے
رہے جو خلوت و جلوت میں روز و شب داخل — مصاحبوں میں ہوئے رفتہ رفتہ سب داخل
غرضکہ ہزل و تمسخر ہوئے وزیر اُس کے — بہت سے اہل ظرافت ہوئے امیر اُس کے
اثر زمانے پہ اُس کا مگر بجا نہ ہوا — جو اُس کو مدنظر تھا وہ مطلقا نہ ہوا
ادب کے طور طریقے بگڑ گئے اُن کے — قدم طریق وفا سے اکھڑ گئے اُن کے
رہا دلوں پہ نہ رعب اُس کی حکمرانی کا — سمجھ کے پی گئے سب اُس کو گھونٹ پانی کا
حیا و شرم و ادب سے خلاف کرنے لگے — ادب کے قاعدوں سے انحراف کرنے لگے
ہر ایک بات میں چالاکیاں لگے کرنے — حضور شاہ میں بیباکیاں لگے کرنے
وہ حسن خلق بہ تمسخر کا نام رکھتے تھے — جو بات کہتی نصیحت تو نام رکھتے تھے

یہ دیکھا خسرو اخلاق نے جو حال اُن کا — اور اُن کے حال نے دکھلا دیا مآل اُن کا
اگرچہ خلق و مروت کا بادشاہ تھا وہ — اور ایسی باتوں پہ کھلتا نہ کچھ نگاہ تھا وہ
پر اُس نے دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی — اور اُن کی آنکھوں میں شرم حیا نہیں باقی
رقم کیا ملک القدس کو یہ حال اُن کا — لکھا کہ حال سراسر ہے پر وبال اُن کا
شتاب چشم کرم سے نگاہ ہو جائے — کہ روئداد جہاں روبراہ ہو جائے

غرض جو تھی شہ اخلاق نے لکھی عرضی — وہ بزم قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی

وہاں نگاہِ توجہ کمال اُس پہ ہوئی
بہت سی قدسیوں میں قیل و قال اُس پہ ہوئی
بڈوں کی ساری بداطواریاں بھی دیکھی گئیں
ظرافتوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

غرض کہ بزم مقدس میں گفتگو کرکے
ہر ایک کے ظاہر و باطن میں جستجو کرکے
کھلا کہ ہو گئے بیباک یہ جو سارے ہیں
اور اُس میں سارے بداعمالیوں کے مارے ہیں
تو بے سبب نہیں گستاخیوں پہ آئے ہوئے
یہ حسنِ خُلق کے ہیں سارے گُل کھلائے ہوئے
سو قوتِ غضبی کو ذرا اشارا ہو
کہ ساتھ اس کے عمل میں حکومت آرا ہو
وہ حسنِ خُلق سے مل کر دوا کا کام کرے
جو دل مریض ہیں اُن پر شفا کا کام کرے

غرض کہ قہر کو فرمانِ خسروانہ ہوا
بلا کی طرح سے وہ دفعتہً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کڑک دمک سے چلا
کہ جیسے شعلۂ باروت ہو بھڑک کے چلا
بسانِ اژدرِ خونخوار سر اُٹھائے ہوئے
اور اُس پہ کلّۂ شیرِ سیہ چڑھائے ہوئے
قضا نے آگ کے سانچے میں اُس کو ڈھالا تھا
جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا
یہ تن پہ اینٹھے تھے غیظ و غضب کے مارے بال
کھڑے تھے شیر کی موچھوں کی طرح سارے بال
تھے مارے طیش کے نتھنے پھڑک رہے دونو
برنگِ شعلہ تھے دیدے چمک رہے دونو
یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا
کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مارا
غضب سے چہرہ پہ گویا جنوں برستا تھا
جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھا
گرج تھی ابر کی اور آندھی اُس کے ساتھ میں تھی
بجائے تیغ کڑک بجلی اُس کے ہاتھ میں تھی
خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا
غبار آگے اُڑاتا شرار آتا تھا

غرض کہ آیا اور اس آن بان سے آیا
کہ جیسے قہر خدا آسمان سے آیا

وہ اُس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا — نہ اُس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا
پڑے تھے تہلکے دنیا کے کارخانے میں — اور اُس کے آنے سے بھونچال تھے زمانہ میں
وہ دو تو ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں — اور اُن کے ساتھ ظرافت کہ تھی امیروں میں
سب ایسے بھاگے کہ اُن کا کہیں نشان نہ ملا — سرِ زمیں نہ ملا زیرِ آسماں نہ ملا
بہت سے لوگ مقامِ حساب میں آئے — بہت سے ترکِ ادب کے عتاب میں آئے
چٹخنے سب پہ ادب کے جو تازیانے لگے — تو مارے ڈر کے جگر سب کے تھرتھرانے لگے
ہزاروں قمچیوں سے پٹ کے فرشِ خاک ہوئے — ہزاروں خنجرِ تعزیر سے ہلاک ہوئے
بہت سے اپنے کیے کی سزاؤں میں آئے — بہت کیے نہ کیے کی بلاؤں میں آئے
پر اُس کے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا — جو روتی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

اگرچہ جو تھا جہاں میں غضب کا مارا تھا — اور اُس کا قہر جو تھا سب پہ آشکارا تھا
پہ شکوہ کر نہیں سکتے تھے زینہار اُس کا — نہ حال لکھتے تھے اخبار روزگار اُس کا

مگر وہ شاہ کہ تھا جس پہ کل کا حال کھلا — اور اُن کے حال میں ایک ایک کا تھا مآل کھلا
نہ اپنے بندوں کا یہ حال زار دیکھ سکا — نہ درد و غم سے اُنہیں دلفگار دیکھ سکا
کیا اشارہ یہ تہذیب کو کہ جاؤ ابھی — اور اعتدال پہ ان کے دلوں کو لاؤ ابھی

اُدھر سے جب یہ عنایاتِ خسروانہ ہوئی — تو بزمِ قدس سے تہذیب ادھر روانہ ہوئی
وہ سوئے اہلِ زمیں ایسی شان سے اُتری — کہ جیسے رحمتِ حق آسماں سے اُتری
نہ اُس کے تاجِ دُرِ شاہوار تھا سر پر — نہ کوئی چتر جواہر نگار تھا سر پر
مگر عمامۂ خاص اُس کو مشتری نے دیا — اور اپنا چتر تھا طالع کی یاوری نے دیا

تھے وہ جو علم نے خلعت اُسے پنہائے ہوئے
اثر عدو کے خدنگِ کلام کرتے نہ تھے
کلام ہاتھ میں تھا آگے تیغ تیز لیے
بناتی آتی تھی تدبیر سارے کام اُس کے
تھی صنعت اپنے گل تر بکھیرتی آتی
اُسی کے رنگ میں دولت تھی جگمگاتی ہوئی

اور اُس کے قامت موزوں پہ ٹھیک آئے ہوئے
اور اعتراضوں کے تیر اُن پہ کام کرتے نہ تھے
تھے جوہر اُس میں سخنہائے شعلہ ریز لیے
خرد تھی کر رہی پردہ میں انتظام اُس کے
اور ان کا رنگ زمانہ پہ پھیرتی آتی
کہ دونو ہاتھوں سے تھی سیم و زر لٹاتی ہوئی

فلک سے جبکہ زمیں پر وہ نیک نام آئی
وہیں محاسن اخلاق بڑھ کے ساتھ ہوئے
وہ آپ ٹیکتی آتی تھی تمکنت کی چھڑی
نہ بات ہر کس و ناکس سے تھی ذرا کرتی
جو حکم کچھ سرِ دربار برملا ہوتے
تھی دوربیں کی جگہ ہاتھ میں لیے اخبار
خلاف وضع نہ تھی بات مطلقاً کرتی

لئے جہان میں آرام خاص و عام آئی
جھکا کے غیظ و غضب سر کو ساتھ ساتھ ہوئے
کہ تمکنت کی چھڑی تھی وہ سلطنت کی چھڑی
وزیر عقل سے تھی گر کبھی مشورا کرتی
تو اُس کی کم سخنی میں سخن ادا ہوتے
جہاں کی سیر تھے اُس کو دکھا رہے اخبار
ہنسی کے حق کو تبسم میں تھی ادا کرتی

غرض کہ پہلے ہی جو اُس نے جشن عام کیا
کہ مدرسے ہیں جو عالم میں جابجا جاری
کہ لڑکے یہاں کے جو محنت سے یاد کرتے ہیں
مگر دلوں پہ اثر اُن کے زینہار نہیں
اگر دلوں پہ اثر ہو تو کیوں عمل نہ کریں
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں

تو نظم خلق کا پہلا یہ انتظام کیا
یہ حکم اُن میں بتاکید ہو نیا جاری
زباں سے لفظ و معانی کو یاد کرتے ہیں
اور اُن پہ کھلتے یقیں اہل روزگار نہیں
بدی کو اپنی وہ نیکی سے کیوں بدل نہ کریں
اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں

کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے
یہ اُن کو منہ سے ہیں بک بک کے نیمجاں ہوتے

اب ان کے ساتھ مطالب کے بھی اثر ہوویں
دلوں میں ان کے یقیں کرتے کرتے گھر ہوویں

یہ حکم جب ہؤا دربار شاہ سے جاری
ہوا انتہا ابھی دفتر کی راہ سے جاری

اُدھر اُدھر کو جو گھاتوں میں تھے لگے اخبار
وہیں زباں بزباں اُس کو لے اُڑے اخبار

ہؤا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری
کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جابجا جاری

نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں
وہ رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں

کہ ان کا فیض مقاصد ہو عام عالم میں
رہیں علوم کے چرچے تمام عالم میں

ولیکن اُن کو بھی تاکید یہ زیادہ ہو
کہ فائدہ کی جو کچھ بات دل نہادہ ہو

باتفاق اُسے مل جُل کے رو براہ کرو
اور اختلاف سے کاموں کو مت تباہ کرو

مثنوی شرافت حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا

نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشان سے غرض

تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے۔ گھر اچھے تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں

کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحب زر ہے تو لیکے زر بیٹھے

یہاں تو مایۂ ہمت ہیں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر تھے اور خود امیر زادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بار تو طن اُٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جسکے پھول ہو تم
کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

عدم سے آنکے کس خاک پر گرے پہلے
وہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصر شاہی میں
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اُس کا نہ عار ہے اِس کی
مگر تلاش ہے تو یار بار ہے اِس کی
کہ رکھتے ملک مروت میں رسم و راہ ہو گیا
دکھاتے ہمت عالی میں دستگاہ ہو گیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایہ
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں
سبک سبک ہیں و یا ہیں گرانبہا چیزیں
میں چاہتا نہیں ارزاں ہیں شے دلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے
متاع حسن دیانت دکان میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ باعقل و ذی شعور ہو تم
مقام تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم
نہ کچھ مقدمہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
پر اُس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم
زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں — جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں
کتابیں پڑھکے جو کیں حفظ برزباں تو کیا — اور اُن میں پاس ہوئے دیکے امتحاں تو کیا
تمہارے خُلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں — زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
فقط جو عالم ذی شان ہوگئے تو کیا — میرے حسابوں وہ شیطان ہوگئے تو کیا

جو کچھ کہ منہ سے کہو اُس کا ہو اثر دل میں — کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وہ گھر دلمیں
زبان و دل ہیں بہم جب کہ ایک ہو جاتے — تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں — ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وہ علم — تمام جب ہے کہ پہنچائے فیض عام وہ علم
وہ علم جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا — ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہو — مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو
میانِ جلسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی — کہو کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی

کہ باصفا و سبک روح و پاک جان ہم ہیں
تو تم جواب میں جھٹ بول اُٹھو کہ ہاں ہم ہیں

معرفت الٰہی

اٹھو آزاد بیٹھے کیا ہو خموش
فصل گل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کنج غم میں ہو بیکار
گل و گلشن کی چلکے دیکھو بہار

لطف صحبت بہم غنیمت ہے
میاں آزاد دم غنیمت ہے

چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر
گل و گلزار و یاسمن کی سیر

گرچہ بہر عوام کالانعام
لطف گلگشت ہوگیا بد نام

پر کرو دل میں تم جو اپنے غور
ہے ہر ایک امر کا علیحدہ طور

نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط
قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط

سینکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں
کہ بری خلق کے گماں میں ہیں

صرف ہووے گر اس میں حسن خیال
تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال

گل و سنبل سے تا خس و خاشاک
خاک سے تا بہ گلشن افلاک

رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی
نہیں عبرت سے کوئی شے خالی

ہر ورق ہے شجر پہ بہر حساب
بکف دست موعظت کی کتاب

گوش عبرت نہیں تو کھولتا ہے
ورنہ ہر برگ یہاں کا بولتا ہے

ہر زبان برگ گوش دل گل ہے
تو ہی مدہوش نشۂ مل ہے

ایک دن دل جو میرا گھبرایا
کلبۂ غم سے میں نکل آیا

دل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا
ہوا گلزار میں گذار مرا

پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا
پا کے ایک جا درخت کا سایا

بیٹھا میں بر کنار آب رواں
کہ ہے عمر رواں حساب رواں

کی جو یکبار آنکھ اُٹھا کے نظر | برگ ایک ٹوٹ کر ز شاخ شجر
اُترا اوپر سے جوں پیام سروش | اور ہؤا مرے زینت آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبان مقال | پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشم بینا ہے | تو یہ قدرت کی لوح مینا ہے
نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ | دیکھ ان کو بہ چشم اندیشہ
صانع غیب کا ہے کار بدیع | کلک صنعت کا ہے نگار بدیع
روے ہستی پہ تھا نہ نام مرا | تھا رگ شاخ میں مقام مرا
فیض آب اور باد کی نرمی | اُس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادر خاک سے ہوئے جو دوچار | روح جنبش میں آگئی یکبار
منہ کو گرد عدم سے صاف کیا | سینۂ شاخ کو شگاف کیا
سبز کوپل تھا جب نکالا سر | پر وہ کوپل تھی غیرت گل تر
کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا | دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یمن قدم یہ آیا راس | ہو گیا ہر درخت خضر لباس
زاد و برگ شجر ہؤا مجھ سے | گل کا آباد گھر ہؤا مجھ سے
بار مجھ میں نہ زینہار آتا | پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاج سر میں پئے نہال ہؤا | مجھ سے سارا چمن نہال ہؤا
خسرو گل کا جب قشون آتا | میرا پرچم تھا پہلے لہراتا
سب کے سر پر تھا نخل کا سایا | میرا سایا تھا نخل پہ چھایا
جس سے سارے جہاں کو راحت تھی | ہر مسافر کو استراحت تھی
شاخ گل تھی ہری بھری مجھ سے | زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے
تھے لطافت سے مری سرو آزاد | مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد

چشم نرگس چمن کا جوبن تھی
برگ گویا زبان سوسن تھی

ساری ذات وصفات ہے مجھ میں
گل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں

کونسی بات مجھ سے چھوٹی ہے
مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے

مرحم زخم جان و خاطر ریش
برگ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

نظم اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں نہ بیاباں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
ہمت یہ کہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں اُمیدوں کی موج زن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
اس دشت میں نہ دوڑ سکا بن کے گرد ہرن
کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ و نام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
باندھی کمر ہے کسکے ہر ایک شاد کام نے
دیوار باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سرو سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
بڑھ جاؤ گے کروگے اگر مار مار تم
چلّا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اُٹھائینگے
طوفاں بابلوں کی طرح بیٹھ جائینگے
دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
نیکی کے زور اُٹھ کے بدی کو دبائینگے

بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں سے چلے چلو

آئینہ دل کا گرد سفر سے اُجال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو

اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے

فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پہ اپنا مدار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
اور ہو کبھی صلہ کے نہ اُمیدوار تم
دو رُخ کو آپ فخر سے رنگ بہار تم

گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
آب رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جو تھم رہے یہاں وہی خر در وحل رہے

تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے
چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے

تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے
اب خاتموں پہ آ گئے ہیں اُن کے فیصلے
وہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے

ہے کترنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

سلام علیک

خدا کی نظر آ رہی شان ہے
سہانا سا ایک سبز میدان ہے

ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا
تو ہے دیکھنے سے مزا آ رہا

ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی
ہوا لوٹ کر لہر کھائی ہوئی

کوئی دل جو مٹی میں ہے رل گیا
تو ایک آدھ گل ہے کہیں کھل گیا

وہیں ایک پہلو میں تالاب ہے
کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے

یہ سبزی اُسی کے سہارے پہ ہے
درختوں کا جھرمٹ کنارے پہ ہے

لب آب جو ہیں شجر جھومتے
وہ ہیں جُھک کے پانی کا منہ چُومتے

سما آج کل ہیگا برسات کا
مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا

درخت ایک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے
ہوادار بنگلے بنائے ہوئے

تو ایک چھوٹے لڑکے نے واں آن کر
جگہ خوب موقع کی پہچان کر

رکھا سامنے اپنا جزدان ہے
ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے

بہت لکھنے پڑھنے کا ہے ذوق اُسے
یہی ذوق ہے اور یہی شوق اُسے

ڈھلا ہیگا دن بج چکے چار ہیں
گئے سیر کو اس کے سب یار ہیں

ولیکن دم صبح یا شام ہے
شب و روز اسے کام سے کام ہے

اسی شغل میں اب بھی مشغول ہے
بنا بیٹھا ایک مرد معقول ہے

خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب
کہ اس میں ہے ڈوبا چو ماہی در آب

اور آتی ہے جوں جوں سیاہی پہ شام
وہ شوقین لڑکا بذوقِ تمام

جُھکا جاتا ہے اس طرح غور سے
کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے

نظر اُس کی جب ترمرانے لگی — سیہ شام سرمہ اُڑانے لگی
بہت بیٹھے بیٹھے جو تھا تھک گیا — ایک انگڑائی لے کر وہ لڑکا اُٹھا
ملا کر بہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ — کھلے چہرے پر لطف محنت کے ساتھ
تھا فارغ جو ہو کر اُٹھا کام سے — تو پھولا برنگ شفق شام سے

لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں — ٹہلنے لگا آ کے میدان میں
لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو منہ پر ہوا — حواس اس کے آئے ٹھکانے ذرا
تھکے دن کے تھکے ماندے جو جانور — وہ اپنے مقاموں پہ سب آن کر
بہم مل کے آوازیں دینے لگے — بسیرے درختوں پہ لینے لگے
وہ مل جل کے آپس میں تھے بولتے — کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے
درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو — جو سمجھو تو پھر یاد بے چوں کہو
جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے — دئے چھیڑ اُنھوں نے بھی سر رات کے
کئی غول طوطوں کے چھکارتے — لگے سبز سبزا ایسے بل مارتے
تھا لڑکا بھی حیراں یہ کیا ہوگیا — کہ میداں کا سبزہ ہوا ہوگیا
کلولوں میں سناٹے بھرتے ہوئے — وہ تھے اس طرح باتیں کرتے ہوئے

کہ خوش ہو کے بولا وہ رنگیں کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

کیا خاتمہ دن کا جب شام نے — تو لی گھر کی راہ اُس خوش انجام نے

ادھر اور اُدھر کو نظر ڈالتا — چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا

کہ کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں — پھریں کھیت سے گھر کی تھیں چاہ میں

ٹپکتی خوشی صورت حال سے — عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے

بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے — کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے

کئی ساتھ ساتھ ان کے گوسالے تھے — کہ ماؤں نے تھن کے تلے پالے تھے

اور ایک گلہ بان پیچھے آتا ہوا — تھا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا

ملیں راہ میں اُس کو کچھ بکریاں — اور ایک بوک بکرا رواں درمیاں

کئی بربری ان میں گلزار تھیں — پہاڑی تو دودوں میں سرشار تھیں

وہ دودوں نہائی تھیں پوتوں پھلیں — کہ دن بھر تھیں چرچگ کے گھر کو چلیں

پھُلروا سے بچّے اچھلتے ہوئے — تھے اٹکھیلیوں سے مچلتے ہوئے

محبت سے ممیاتا جاتا کوئی — بہت تھک کے ماں کو بلاتا کوئی

انہیں دیکھ کر گھر کے شوقونیں شاد — لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش نہاد

بھرو شیرِ مادر سے اُلفت کے جام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

وہ لڑکا جو پہنچا بنزدیک شہر — نظر آئی یہاں اور ہی لہر بہر

دوکانوں پہ روشن سراسر چراغ — چراغوں نے گویا لگائے تھے باغ

جو رونق کرتے نیچے دوکانوں پہ ہے — کچھ اس سے سوا بالاخانوں پہ ہے

دکھاتے جو ہیں روشنی دور سے — اُڑی جاتی ہیں کھڑکیاں نور سے

تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر — طرحدار کمرے ہوادار گھر

کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار — گہے شعر خوانی ہے گاہے ستار

غزل ریختے کی ہے گاتا کوئی ‏— ہے گاتا کوئی اور بجاتا کوئی
لطیفوں پہ اُڑتے ہیں جو قہقہے ‏— کہاں یاد بلبل کو یہ چہچہے
غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا ‏— تماشے خدائی کے کرتا ہوا
گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ ‏— تو ماں باپ بھی ہوگئے باغ باغ
خوشی سے نہ جامے میں پھولوں سمائے ‏— بہن بھائی بولے وہ آئے وہ آئے
سلام اس نے پہلے کیا باپ کو ‏— جھکایا بہ حُسن ادب آپ کو

دُعا دی یہ اُس نے بھی لے کر سلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

بچھا صحن میں تھا بڑا سا جو تخت ‏— وہاں آکے بیٹھے وہ فرخندہ بخت
لگا سامنے آکے دستار خواں ‏— بہم کھا کھلا کر ہوئے شادماں
فراغت ہوئی کھانے پینے سے جب ‏— بچھونوں پہ آئے قرینے سے تب
برابر برابر بچھے تھے پلنگ ‏— پڑیں چادریں ان پہ مہتاب رنگ
فلک نیلگوں رنگ نکھرے ہوئے ‏— ستارے تمام ان پہ بکھرے ہوئے
چمک کر چڑھا چرخ پر چاند تھا ‏— کہ سورج کا منہ کر دیا ماند تھا
ادھر چاندنی نور پھیلا رہی ‏— سیاہی اُدھر رنگ دکھلا رہی
وہ چھائی ہوئی رات تاروں بھری ‏— کہ چادر ہو جیسے ستاروں بھری
پلنگڑی پہ لڑکا تھا لیٹا ہوا ‏— کہ بیٹھا تھا شکّر لپیٹا ہوا
پدر تھا جو تاریخ کا رازداں ‏— سناتا تھا ہر دم نئی داستاں
کبھی کرتا خود شعر خوانی تھا وہ ‏— کبھی سنتا ماں سے کہانی تھا وہ
دیا یہ مزا اُن حکایات نے ‏— کہ انگڑائی گردوں پہ لی رات نے

ہوا آ کے پنکھا ہلانے لگی
ہر ایک کو غرض نیند آنے لگی

تھکے ماندے دن بھر کے تھے ہو رہے
دوپٹے لئے تان اور سو رہے

بیاں کیا کروں رات کی شان کا
زمانہ میں عالم وہ سنسان کا

پڑا نیند میں مست سارا جہاں
نہ تھے چور باقی نہ تھے پاسباں

پڑے سوتے سب ایسے مدہوش تھے
کہ گھڑیال تک بھی تو خاموش تھے

درختوں میں تھیں جو گزرتی ہوائیں
زمانہ پڑا کرتا تھا سائیں سائیں

شب تار بھی نیند میں آن کر
سیہ چادر اپنی پڑی تان کر

ہمیشہ زمانے کا دستور ہے
اندھیرے سے کرنا عیاں نور ہے

کہ چمکا ستارہ سحر گاہ کا
ہوا رنگ پھیکا رُخِ ماہ کا

ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں
تعجب سے مشرق کو تکنے لگیں

شب تار کا رنگ فق ہو گیا
چراغِ سحر جاں بحق ہو گیا

ہوئی یک بیک روشنی سی نمود
اُبلنے لگا دیگ مشرق سے دود

سحر کے جو عالم نمودار تھے
دھوئیں اُڑ رہے تھے شب تار کے

لگے بولنے سب سحر کے طیور
گئی اُن کی آواز نزدیک و دور

وہ لڑکا جو تھا بسترِ خواب میں
ستارہ ہو جوں چادر آب میں

اُٹھا کر کہا اس نے تکیہ سے سر
سلام علیکم مبارک سحر

جسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقع عبرت نیا دکھاتا ہے — اور ایسے شخص کا ایک ماجرا سناتا ہے
کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اُسکے لئے — یہی زمین تھی یہی تھا زمانہ اُس کے لیے
فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا — جو پوچھو کون؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا
مٹایا گردش گردوں نے آہ نام اُس کا — نہ آج نام ہے اُس کا۔ نہ کچھ مقام اُس کا

پر اتنا سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے — خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے
کبھی اُمید سے اور گاہ نااُمیدی سے — کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے
جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا — خیال اس کا مرقع نیا بناتا تھا
یہ دل جو سینہ میں جنبش ہے دمبدم کرتا — کہ ہے اسی پہ ہر ایک زندگی کا دم بھرتا
دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے — کوئی یقین ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے
ہمائے ہمت عالی کا اوج پر جانا — کبھی یہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا
غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ — کہ آخرش یہی انسان باشعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا — جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا
جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ — جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ
مگر میں کیا کہوں مجھ کو تو اب یہ رونا ہے — کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں — یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں

بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں
بہار میں سرِ سبزہ کو تاج دیتے ہیں

یہ فرشِ خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر
یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر

جب اُس کے طوقِ گلو زندگی کا قصہ تھا
تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصہ تھا

یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اُس کو کچھ خبر بھی نہیں
جو ہو تو نفع نہیں گر نہ ہو ضرر بھی نہیں

بلا سے اس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے
دیا کہ ملک فنا گلشن بقا ہو جائے

وہ آپ ہی جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا
زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں

یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے
ستارے جن سے زمین آسمان روشن ہے

کسی میں دور کا اس کے نشاں نہیں باقی
پتا تلک بھی تہ آسماں نہیں باقی

قضا نے لیکے الٰہی کہاں چھپایا اُسے
زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حسنِ پریوش کا وہ دیوانہ تھا
اور اُس کے تیرِ ادا کا ہوا نشانہ تھا

پر اب جو دیکھو تو وہ غیرتِ پری بھی نہیں
وہ اُس کے ناز وہ انداز دلبری بھی نہیں

فنا کے بزم میں ساقی نے اُس کو جام دیا
مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا

طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی
خود آیا حسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی

فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے
دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جب ہیں جہاں ہوا پیدا
اور اُس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا

کتاب عمرِ جہاں آج تک پڑھی میں نے
ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے

ہر اک کا راز ہے اُس میں کہیں کہیں کُھلتا | پر اُس غریب کا احوال کچھ نہیں کُھلتا

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

جغرافیہ طبعی کی پہیلی

جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر زبانہاے مشرقی کی فرمائش سے نظم کی گئی تھی

ہنگامۂ ہستی کو
ہر خشک و ترِ عالم
جو خاک کا ذرّہ ہے
حکمت کا مرقع ہے
انداز سے ہے جاری
اک رنگ کہ آتا ہے

گر غور سے دیکھو تم
صنعت کے تلاطم میں
یا پانی کا قطرہ ہے
جس پر قلم قدرت
اور کرتا ہے گلکاری
سو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی
خرمہرۂ رنگیں - یا
ہر لحظہ و ہر ساعت

آنکھیں تو کھلی ہیں پر
بلّور کے ٹکڑے ہیں
قدرت کے تماشے ہیں

عالم میں پڑے ہوتے — پر اُن کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے — اور ہے تو سبب کیا ہے؟

ایسے بھی مگر اکثر — ارباب بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہر دم — ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرّہ ہو کہ ہو سورج — معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوہ قدرت میں — سُرمہ اُنہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی — اور عینک عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی — جس سے کہ زمانہ کی
گرمی ہو و یا سردی — یا ہووے تری خشکی
حکمت کا معمّا ہے — قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اُس میں — ہے عقدۂ سربستہ
عقدہ ہے اگر اُس میں — ہے نکتہ برجستہ

اک سیدھی سی بات اس وقت — آئی ہے تصور میں
وہ یہ ہے کہ دو چیزیں — کیا ایسی ہیں دنیا میں
آپس میں جو رکھتی ہیں — پیوندِ زنا شوئی
اولاد سے جن کی سب — آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ — سب نے اسے مانا ہے
اور پھر اُنہیں دونو کو — دیکھو جو نظر بھر کر
ماں بیٹی کا ہے ناتا — دونو میں نظر آتا

شورشگہِ عالم میں
اصلوں کی بہت نسلیں
اس پیچ کا پر رشتہ

پیدائشیں لاکھوں ہیں
رشتوں کے سر رشتے میں
دیکھا نہ سُنا کوئی

آزاد۔ بھلا ہے کون
یا بند گرہ کھولے
کر حسن کے سوال اپنا

جو آگے تیرے بولے
ہاں یہ کہ مگر تو ہی
دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں
عالم میں ہیں دو جوہر
صنعت گہ قدرت میں
سب عالم جسمانی

ہے عقد زن و شوہر
خشکی و تری جن سے
پیدا و ہویدا ہیں
حیوانی و انسانی

اور دوسرے رشتہ سے
تو دیکھ لو پانی کو
بادل ہو کہ ہو باراں
شبنم سے بھی کم ہووے
اک عرصۂ خاص اُس پر
خشکی کے نشان ہوتے
یا بچے ہیں۔ جو ما کی

گر غور کرو دل میں
جس رنگ میں جی چاہے
قطرہ ہو و یا دریا
یا نام کو نم ہووے
گزریگا تو دیکھوگے
اس میں سے ہویدا ہیں
آغوش میں پیدا ہیں

کیوں قبلۂ من دیکھا
کیا بوجھے کوئی پنڈت
ہاں سمجھیں میاں آزاد
سنبل ہے یہ سبزہ میں

یہ طرفہ معمّا ہے
یا فلسفی و مُلّا
یا منشی ذکاء اللہ
پھولوں میں چنبیلی ہے

کون اس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

مبارکباد جشن جوبلی

اے خوشی آ تیرے آنے سے زمانہ روشن
اے خوشی آ تیرے آنے سے ہے گھر گھر شادی
یاد میں بیٹھے تھے یاران دل آگاہ تیری

آ کہ تو آپ ہے روشن تیرا آنا روشن
ہے تیرے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی
سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تیری

ہم خوشی اُس کو نہیں کہتے جو ہر سال آئے
کبھی عیدِ رمضاں ہو کبھی عید قرباں
عیدیاں بانٹ کے بچوں کے جو دل شاد کرے

خلعت عید میں ہنستی ہوئی خوشحال آئے
ہاتھ پھیلائے گلے ملتے ہوں بڈھوں سے جواں
ہول و ہنگامہ سے بازاروں کو آباد کرے

خوشی اُس کو بھی نہیں کہتے جو نوروز ہوئے
سبزہ و گل میں عیاں عالم نیرنگ کرے

گل و گلشن کے لئے جشن دل افروز سے ہو
خاک کو سبز کرے سبزہ کو گلرنگ کرے

وہ خوشی کیا کہ ہو رُخ جس کا فروزاں شب کو — اور دوالی سے کیے جشن چراغاں شب کو
جا بجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے — کہیں آنا کہیں پیسا کہیں پائی بانٹے
خوشی اُس کو نہیں کہتے جو کرے نام سے خوش — امتحان لیکے کرے بچوں کو انعام سے خوش

وہ خوشی کیا کہ جو گھر بیٹھکے ہم آپ کریں — ہر برس سالگرہ بچوں کی ماں باپ کریں

ہے حقیقت میں خوشی وہ کہ بافضال خدا — ہند پر قیصرۃ الہند ہوں فرماں فرما
جب باقبال و حشم گزریں اُسے سال پچاس — جا بجا جشن خدا ساز کے ہوویں اجلاس
ہووے لاہور میں دربار نشاط و شادی — اور پڑھے اُن کے آزاد مبارکبادی

یہ خوشی وہ ہے کہ دل جس سے ہیں خنداں خنداں — یہ خوشی وہ ہے کہ ہو عید بھی قرباں قرباں
ہے خوشی عام دلوں کے لئے اور جاں کے لئے — یہ خوشی عام ہے ہندو و مسلماں کے لئے
کہتے ہیں بندۂ بے دام و درم حاضر ہیں — اور اگر جان کا موقع ہو تو دم حاضر ہیں
کہ وہ سارے تھے جو ادبار کے مارے پھرتے — اور سعادت پہ نہ تھے اُن کے ستارے پھرتے
سرپرست اُن کا نہیں کوئی زمانہ میں رہا — حال باقی نہیں کچھ اُن کے فسانہ میں رہا
اس برس پرورش عام جو مبذول ہوئی — واسطے اُن کے بھی تدبیر یہ معقول ہوئی

ہوئی مشہور زمانہ میں جو یہ خوشخبری — گھر بہ گھر دل کی اُمیدوں نے ہے کی جلوہ گری
کہیں ساماں ہے کہیں بے سروساماں خوش ہیں — یہ خوشی وہ ہے کہ ہندو و مسلماں خوش ہیں

رات درگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں — دن کو پھرتے ہیں تو شکرانے ادا کرتے ہیں

ان میں ہے بندۂ آزاد یہ کہتا بہ نیاز
اُن کے فرزند سدا خرّم و دلشاد رہیں

حضرت قیصرۃ الہند کی ہو عمر دراز
اُن کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں

جاری اس جشنِ مبارک کا سدا دور رہے
روشِ گردشِ دولاب یہی طور رہے

ایک تارے کا عاشق

ایک سخنور کسی تارے کا تماشائی تھا
دل سے وہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہوا تھا
وہ ستارا کہ ہوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے
اوجِ معنی سے مضامیں تھا اتارا کرتا
چشمِ حیرت سے نظر اس پہ سدا کرتا تھا
غم جو ایک شب اسے بیتاب و تواں کرنے لگا
ہے تو تو رشک پری غیرت صد حور ہے تو
منہ تیرا مہر صفت ہیگا دمکتا پیارے
اے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں
ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر
دم نکل جائے تو ہو یار مبارک مرنا
اپنے تارے کو جو حسرت سے یہ تکتا تھا پڑا
آدمیت اُسے تب اُس کے خیالات نے دی

اُس کے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
اور وہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا
چشمِ حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اُسے
اور اُنہیں اپنے ستارہ پہ تھا وارا کرتا
دل کے سب راز و نیاز اس سے ادا کرتا تھا
منہ ہی منہ میں یہ سخن اس سے بیاں کرنے لگا
مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دور ہے تو
سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھجکتا پیارے
چشمِ حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں
قطعہ
ہائے چھاتی سے تجھے اپنی لگا لوں کیونکر
یوں ہو مرنا تو ہے سو بار مبارک مرنا
جامِ دل جوشِ محبت سے چھلکتا تھا پڑا
دفعتہً جنبشِ دھر شوق ملاقات نے دی

بن کے عورت کشش عشق کی ماری آئی
آسماں چھوڑ زمیں پر وہ بچاری آئی

بولی پھر اُس سے کہ اے شاعر شیدا میرے
شوق دیدار سے تھے دل میں ترے کیا کیا میرے

کشش شوق نے تیری مجھے بلوا ہی لیا
تو وہ عاشق ہے کہ آخر کو مجھے پا ہی لیا

یہ تو بتلا کسی عورت کی ہے چھاتی اچھی
یا کرن تارے کی شب کو نظر آتی اچھی

سنی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت
بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچھتایا بہت

بولا افسوس وہ تارا جو اُڑاتا تھا مجھے
اوجِ افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے

آج وہ نور فلک ہاتھ سے کھویا میں نے
بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے

تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا
میں نے یہاں عاشق شیدا سخن آرا کھویا

محنت کرو

ہے امتحاں سر پہ کھڑا۔ محنت کرو محنت کرو
باندھو کمر بیٹھے ہو کیا۔ محنت کرو محنت کرو

بیشک پڑھائی ہے سوا۔ اور وقت ہے تھوڑا رہا
ہے ایسی مشکل بات کیا۔ محنت کرو محنت کرو

شکوے شکایت جو کرتے۔ تم نے کہے ہم نے سُنے
جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ محنت کرو محنت کرو

محنت کرو انعام لو۔ انعام پر اکرام لو
جو چاہو گے مل جائیگا۔ محنت کرو محنت کرو

جو بیٹھ جائیں ہار کر۔ کہدو انہیں للکار کر
ہمت کا کوڑا مار کر۔ محنت کرو محنت کرو

تدبیریں ساری کر چکے۔ باتوں کے دریا بہ چکے
بک بک سے اب کیا فائدہ۔ محنت کرو محنت کرو

یہ بیج اگر ڈالو گے تم۔ دل سے اسے پالو گے تم
دیکھو گے پھر اسکا مزا۔ محنت کرو محنت کرو

محنت جو کی جی توڑ کر۔ ہر شوق سے منہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ۔ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سوداگری۔ ہو بھیک یا ہو چاکری
سب کا سبق یکساں سنا۔ محنت کرو محنت کرو

جس دن بڑے تم ہوگئے دنیا کے دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کہاں محنت کرو محنت کرو

بچپن رہا کس کا سدا۔ انجام کو سوچو ذرا
یہ تو کہو۔ کھاؤ گے کیا۔ محنت کرو محنت کرو

قصیدہ در تہنیت ولادت جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام

جہاں کی شادی و غم کا نہ کر خیال آزاد
کہ عیش و عشرت عالم ہے موج جنبش باد

بدلتی رہتی ہے ہر دم ہوا زمانہ کی
کبھی صبا کبھی صرصر کبھی ہے گرد آباد

ہمیشہ رہوے اگر ایک حال پر عالم
تو کہوے کون کہ حادث ہے عالم ایجاد

ہیں ایک دم میں بدلتے جہاں کے سو سو رنگ
عجب بنا پہ ہے بنیاد قصر سبع شداد

نہ ہیں خزائن قاروں نہ ملک دقیانوس
نہ بوستان ارم ہے نہ قصر ذات عماد

نہیں فساد سے خالی کبھی یہ دار حدوث
کیا ہے عالم فانی بنائے کون و فساد

ہوا کے گھوڑے پہ جاتے ہوں جو سلیمان اثر
ہوں دم میں فرش زمین جوں سطیح مادر زاد

کہاں ہے لشکر عاد اور کہاں ہے قوم ثمود
کہاں ہے لشکر فرعون و جاہ ذی الاوتاد

کہاں ہے مملکت بخت نصر و اسکندر
کہاں ہے شوکت ہامان و نخوت شداد

کہاں ہے حکمت لقمان و عقل اسطالیس
کہاں ہے خم فلاطوں و گنبد فولاد

ہے آب آئینہ خاک دہان اسکندر
ہے زر دفینہ قاروں شہیر شہر و بلاد

وبال دوش ہے زیر زمیں بھی باز عذاب
کہ بخت نصر کو بختی کہے ہے لعنت باد

کہاں ملاحت لیلا و خوبیٔ عذرا
کہاں ہے لعبتِ چینی و دلبر نوشاد

وہ سروِ ناز ملے بسکہ خاک میں یکسر
اسی الم سے پریشاں ہے طرۂ شمشاد

نہ کیونکہ ناطقہ ہو سرمہ در گلوے بیاں
کہ دیوے کوہ جواب اور ندے صدا فرہاد

جو ملک ہو دیں جہاں وسعتِ ارم تزئیں
جو قصر ہو دیں فلک رفعت و جبل بنیاد

وہ اہل فہم و فراست وہ اہل علم و کمال
کہ ہو دیں عقل میں پیرِ فلک کے بھی استاد

مٹا دے نام و نشان اُن کا لوح ہستی سے
بسیل حادثہ اسطرح چرخ زشت نہاد

کہ جیسے مل گئی آنکھوں کے آگے خاک میں ہے
سواد دہلی و جمعیت جہاں آباد

اگرچہ ذکر گذشتہ فضول ہے لیکن
ہوں آمد سخن اتنا ذرا دلا تا یاد

کہ وہ زمانہ بھی ہے یاد تم کو حضرتِ دل
جو ایک جا پہ تھے ہم اور تم کہیں آباد

عجب مزے سے گزرتی تھی زندگی باہم
کہ تم بھی شاد تھے عالم میں اور ہم بھی شاد

نہ ہم کو جان کا ڈر تھا نہ تم کو مال کا غم
نہ ہم کو فکر معاش اور نہ تم کو فکر معاد

نہ ہم اسیر محبت نہ تم اسیر بلد
جو تم ہر امر میں بے قید تھے تو ہم آزاد

کہ اس میں آئی رجب کے جو تیرھویں تاریخ
ہجوم عیش سے عالم ہوا نشاط آباد

ہوائے عیش و طرب سے برنگ غنچۂ گل
ہوئے شگفتہ دل مومنانِ نیک نہاد

زہے نشاط کہ پہنچے بگوش چرخ بریں
صدائے تہنیت شادی و مبارکباد

ہوئے سب انجمن آرا جو آکے ایک جا پر
تو تنگ ہو گیا میدان گلشن ایجاد

اور اُن میں آن کے مانند عندلیب بہار
ہوئے وہ زمزمہ پرداز ہم علی الاشہاد

کہ کہتے اہل زمیں تھے زمیں پہ صلِّ علیٰ
فلک پہ کہتے تھے اہل فلک کہ رحمت باد

یہ اب خدا نے وہی دن جہاں میں دکھلایا
پڑی ہے از سرِ نو طرح عیش کی بنیاد

دلا جو کچھ کہ تھا سرمایۂ بساطِ جہاں
اگرچہ صرصر آفت نے کردیا برباد

کہ جی کو صبر ہے نہ تن میں جان نہ چشم میں خواب
کہ میں ستم زدہ ہوں ناشکیب و تو ناشاد

بہ صدق دل سے ہے گر دعوئے ولائے علی — تو دیکھ پیر طریقت کا بھول مت ارشاد

خوشی کو چھوڑ کے کر غم میں اہلبیت کے غم — غم اپنا بھول کے شادی میں اُن کی ہو دلشاد

رہا نہ جبّہ و دستار اگر سر و پر ہیں — تو کہدے ہو کے سبکدوش درد سر کم باد

چمن سے گرچہ جدا ہو کے ہے غراب البین — مگر صدا کو نہ بھول اپنی کر خدا کو یاد

کہ اپنا فخر تو ہے بندگی آل نبی — ہے اپنا کام تو مدح ولی رب عباد

نہ بھولے ہائے کبھی اپنی بلبل و قمری — قفس ہو یا سر گلبن ہو یا نہ شمشاد

نہ جائے مر کے بھی اہل ہنر کا جوہر طبع — کہ کشتہ ہو کے بھی ہے قاطع مرض فولاد

غرض حضور میں ہوتا ہوں چلکے مدح سرا — کہ بزم دہر میں ہے عید فرحت میلاد

پڑھوں وہ مطلع پر نور رشک صبح بہار — کہ جس کو سُن کے نہ رگل پہ بیٹھے گرد کساد

پڑھوں وہ مطلع پر نور میمنت آمود — کہ جس کو پڑھکے ملک دیں بہم مبارکباد

عجب نہیں ہے کرے گر یا اعتقاد تمام — برائے ورد شب و روز اس کو قنبر یاد

وہ یہ ہے مہر عقیدت کا مطلع پر نور — کہ ہو وے مطلع صبح وظائف و اوراد

تو وہ امام کہ تو نے مجھے کیا آزاد — میں وہ غلام کہ ہوں اب بھی بندۂ منقاد

نہ کیونکہ دو تو گھر آباد تجھ سے ہوں کہ ہے تو — خدا کے گھر کا چراغ اور رسول کا داماد

نہ کیوں کہ ارض و سما تجھ پہ ہوں فدا کہ ہے تو — نبی کا نائب و روح الامین کا اُستاد

تو وہ ہے جوہر اول کہ تیری ذات شریف — پئے وجود دو عالم ہے علت ایجاد

تو ہے ائمہ دین ہدے کا راس رؤس — تو انبیائے سلف کا فلذۃ الاکباد

شہا جو فیض کرم ہو ترا بہار افشاں — تو رشک گلشن جنت ہو گلخن جداد

جو تیرا دست حمایت ہو جامۂ ضعفا — تو ٹوٹے بیضۂ قمری سے بیضۂ فولاد

جو تیرے خوف سے قالب تہی کریں ظالم — نیام خنجر بیدم ہو خنجر فولاد

زمیں سدا رہے پھرکی کی طرح گردش میں — جبال حلم ترے گر نہ اس میں ہوں اوتاد

ترے مصالح حکمت جو دیویں استحکام
حباب بحر ہوں رشک برج سپہر شداد

جو پا فتادوں کا عالم میں دستگیر ہو تو
تو نخل تاک ابھی اُٹھ کھڑا ہو جوں شمشاد

نہ ہو امامت اگر تجھ سے مستند شاہا
کتاب دہر سے ہوں محو معنئ اسناد

شہا نہ عد فضائل ہو تیرا عشر عشیر
ہزار بار ہوں قاصر مراتب اعداد

کہ ہر عمل میں سر فرد عقل ہندسہ داں
الوف ہوویں مات اور مآت ہوں احاد

وہ نور حق ہے تو اسے فخر دودۂ آدم
کہ ہے بدیہ عیاں شکل جامع الاضداد

ترا ثبوت فضائل ہے کسر شان تیرا
رواج عالم خاکی میں تیرا عین کساد

مقابلہ کس و ناکس سے تیرا عالم میں
مثال آئینۂ مہر و کور مادر زاد

کہ ذات حق سے ہے تو وصل مثل جوہر فرد
نہ وہ خزف کہ جو ہوویں ثلاثۃ الابعاد

شہا منازل دنیا سے کام کیا تجھ کو
ترے غلام ہیں قید دو کون سے آزاد

سر نیاز رکھیں ہیں جو سنگ در پہ ترے
نہ ماریں بھولکے ٹھوکر بتاج و تخت و قباد

رہینگے دامن دشت نجف میں ہو کے غبار
بلائے خاک ہیں گردوں دیا کرے برباد

ہزار ظلم سہیں لیک تیرے در کے سوا
کہیں نکالیں نہ دست تظلم و فریاد

فلک سے آگ بھی برسے تو منہ سے اُف نکریں
کہ سلسبیل سے پاتے ہیں آب یہ شمشاد

ولائے ساقی کوثر سے ہو کے مست الست
خمار دہر سے بیخود ہیں ہر چہ بادا باد

پر اب نگاہ کرم چاہئے ہے یا مولا
غلام خاص سے ہے منتخب یہ خانہ زاد

غلام کا تو شہا کام ہے خطا کاری
تمہاری ذات سے عفو و کرم کی ہے بنیاد

بس اب کرم کی نظر کیجے برائے حسین
شہید و تشنہ فولاد و خنجر بیداد

نہ آستانۂ دولت سے رکھئے دور مجھے
کہ مشت خاک ہے عالم میں در بدر برباد

مرا تو عقدۂ مشکل رہے حضور کے ہاتھ
پڑے نہ دست خلائق میں اسکے بست و کشاد

جو کچھ کہ گزرا ہے سب ہے حضور پر روشن
کہ گھر تباہ ہوا اور خانماں برباد

یہ لاکھ شکر کہ ثابت قدم ہے دل اب تک
اگرچہ سیل حوادث نے توڑ دی بنیاد

ہوا ایسے حال میں پر خاک زندگی کا لطف
زمانہ بر سرِ کیں چرخ بر سرِ بیداد

نہیں ہے قطرہ خوں دل میں نام کو لیکن
ہیں اشک چشم رواں مثل دجلۂ بغداد

زبس یگانہ و بیگانہ سب ہیں تشنۂ خوں
کرے ہے موے بدن کار نشترِ فصّاد

پڑی بلا پہ بلا اس قدر کہ آنکھوں میں
جہاں سیاہ ہے مانند کورِ مادر زاد

بہ تنگ ہو کے زمانہ کے ہاتھ سے ہر دم
نکلتی دل سے صدا ہے کہ یا علی فریاد

پھرا ہوں اُڑتا اِدھر کا اُدھر اُدھر کا اِدھر
بگرد باد حوادث بسان کاغذ باد

حصار چرخ سے جاؤں مگر نکل کے کہاں
کہ گھیرے بیٹھے ہیں رستوں کو زادہ ہائے زیاد

کرم کی ہو نظر اے آفتاب عز و شرف
کہ چھائے عالم ہستی میں ظلمت بیداد

بس اب تو ہو شب راحت نصیب جان حزیں
کہ میں بھی بیٹھ کے روشن کروں چراغ مراد

کمی ہے حضرت عالی میں کونسی شے کی
عطا ہوں مطلب دل حد آرزو سے زیاد

رجوع قلب سے سب مومنین کہیں آمین
بحق احمدؐ مرسل و آلہ الامجاد

۴ ## نوطرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہؤا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
دامان کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
پتے تھے آکے جاڑے نے سب دور کر دئے
اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آگیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں

شملہ پہ مجھ کو موسم سرما بسر ہؤا
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید
اور تھے درخت برف نے بلّور کر دئے
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا
ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے ہوئے نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

ہمت کا اس کی حال میں لکھ کر سناؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں تھی صدا

کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
پیدا شکوہ شان تھی اُس کے نشان سے
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
لیکن خموشی اُس کی بآواز کرتا

دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو!

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا
جو آکے خود سیاہی شب راہ پر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سر دیوار سامنے

دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
دروازوں سے چراغ نمودار سامنے

تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکار — تارے بھی اک کنارے سے نتھے آنکھ مارتے
آرام کہ رہا تھا کہ آگے نہ جانہ جا — اور ہیں بھی کہ رہا تھا کہ سچ سچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہ رہے

چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو!

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا — موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہُوا — ہے یہ فضا کہ موت کا منہ ہے کھُلا ہُوا
مانا کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں — جانا کہاں ہے جان کا بھی تجھ کو ڈر نہیں
یہ سن کے نکلا شعلہ دلِ نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے

اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو!

تھی رات رنگ ابھی رُخِ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی
کیا جانے ہم نکل کے کدھر کے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اُتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آواز دے رہے — مل جُل کے ساتھ جیسے ہوں دمساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں — جو زیر و بم کی دور سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے — کی نذرِ گل سے بُلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجئے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشمِ ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پھر اتنا مسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو!